

# فدائی کی گوری



# فتنہ کی گولی





# فدائی گوری

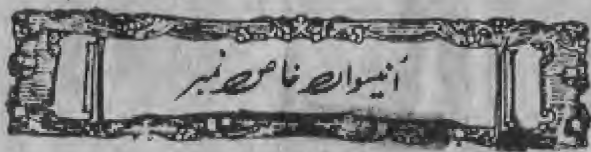


AHMED BOOK STALL  
& STATIONERS

A. M. No: 2, Shahrah-e-Linqab  
BURNS ROAD, KARACHI.



• محمود • فاروق • فرزانه • انیسٹر جمشید  
آفتاب • آصف • فرحت • انیسٹر کامران مرزا  
اور شوکی برادرز کی مشترکہ مہم



قتلے کی چوری

اشتیاق احمد



# اشتیاق احمد

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کھڑی کے مہر پر یہ فرماتے سنا ہے کہ لوگ جمعے کو چھوڑنے سے باز رہیں۔ یعنی جمعے کے دن کی نماز کو نہ چھوڑیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا اور وہ غافل لوگوں میں شمار ہونے لگیں گے۔ (مسلم)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص جمعے کے دن نہائے اور جس قدر ممکن ہو پاکی حاصل کرے، اتیل لگائے یا خوشبو جو گھر میں موجود ہو لگائے، پھر گھر سے نماز کو نکلے اور دو آدمیوں کے درمیان مسجد میں گھس کر نہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں



نام خاص نمبر ————— فتنے کی چوری

طالب ————— اشتیاق احمد

مطبع ————— زاہد اشیر پرنٹرز، لاہور

بار اول ————— جولائی ۱۹۸۸ء

طباعت سرورق ————— سپریم پرنٹرز، لاہور

فنانی مشیر ————— ملک محمد اکرم ماہیو، کھیٹ

کتابت ————— محمد سعید نامدار

سرورق ————— محمد جاوید چٹائی

قیمت —————

## اشتیاق احمد کی کتب

۹/۱۲ نصیر آباد ————— مسلم پوسٹ ————— سائڈ کمان ————— لاہور

فون نمبر: 321537

## دوباتیں

السلام علیکم !

میری زندگی کا پہلا خاص نمبر جبرائیل کا منصوبہ تھا۔  
اس کے صفحات قریباً ۳۰۰ تھے اور قیمت بارہ روپے،  
دوسرا خاص نمبر لکھا تو وہ اس سے کچھ بڑا ہو گیا۔  
تیسرا اس سے بڑا۔ اس طرح یہ سلسلہ آگے ہی  
آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گزشتہ خاص نمبر  
”سنہری چٹان“ ۱۲۰۰ صفحات پر پھیل گیا اور اس  
مناسبت سے اس کی قیمت ۶۳/۰۰ روپے تک  
پہنچ گئی۔ سنہری چٹان کے بعد جب خاص نمبر  
لکھنے کے بارے میں آئی تو میں سوچ رہا تھا کہ  
کروں تو کیا۔ ایک رات تو یہ تھا کہ سنہری چٹان  
جتنا خاص نمبر لکھا جائے۔ یا پھر باطلہ قیامت جتنا۔  
لیکن پھر اچانک خیال آیا۔ اب میری یہ ضخامت  
تک جا پہنچا ہوں۔ لہذا کیوں نہ پھر وہاں سے

بیٹھے، پھر جس قدر اللہ نے اس پر نماز فرض کی  
ہے، اس کو پڑھے، پھر جب امام خطبہ پڑھے  
تو خاموش بیٹھا رہے تو اس کے وہ تمام گنہ جو  
ایک جھٹے سے دوسرے جھٹے تک اس نے کیے  
ہیں، معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (منظاہر حق)

○

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ اپنے والد سے  
روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ  
نے کہ جو شخص جمعہ کے دن آدمیوں کی گردنوں کو  
پھاندے گا، بنایا جائے گا وہ شخص پل جہنم کی طرف۔  
(ترمذی)

○

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ  
ﷺ نے دونوں گھٹنوں کو پیٹ سے ملا کر بیٹھنے  
سے منع فرمایا ہے، اس وقت جب کہ جھٹے کے دن امام  
خطبہ پڑھتا ہو۔ (ترمذی، ابوداؤد)



شروع کر دے۔ جہاں سے خاص نمبروں کا سلسلہ  
 شروع ہوا تھا۔ یعنی جہاں کا منصوبہ ہے۔ یہ خیال  
 دل کو جاگیا۔ اور میر نے اس پر عمل کر ڈالا۔  
 آپ کو میرا یہ خیال اور فیصلہ عجیب تو لگے گا۔  
 شاید غریب بھی لگے۔ کیوں کہ ۱۴۰۰ صفحات کے  
 خاص نمبر کے بعد تو یہ خاص نمبر خاص نمبروں کا پتہ  
 ہی محسوس ہو گا۔ لیکن آپ بھی تو بچے ہیں اور  
 بچے بہت پیاری چیز ہوتے ہیں۔ لہذا ہو سکتا ہے  
 یہ خاص نمبر آپ کو کئی ضخیم خاص نمبروں سے بھی  
 اچھا لگے۔ بلکہ ان پر بخاری محسوس ہو۔ خیر۔  
 یہ تو وقفہ بتائے گا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ میں تجربہ  
 کر چکا۔ اب آپ پرٹھ کر تجربہ کریں گے۔ فیصلہ  
 تو آپ ہی دیں گے۔ اور میں انتظار کروں گا۔  
 یہ تو بات تھی خاص نمبر کے ضخامت کے۔  
 اب ذرا لگے ہاتھوں میں اپنے بات بھی کر  
 گزروں۔ پتہ بات یہ ہے کہ ان دنوں میرے  
 دائیں ہاتھ کے چوڑے انگلی سفید رہنے لگی ہے۔  
 ہر وقت سفید رہتی ہے اور درد بھی ہوتا ہے۔  
 ڈاکٹر صاحب کا مشورہ ہے۔ میں کچھ آرام کر لیا

کروں۔ کچھ آرام کر لیا کروں کا طریقہ تو کوئی  
 سمجھ میں نہیں آ سکا۔ ہاں ایک بات سمجھ میں  
 آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ آئندہ ماہ آپ کو پڑھنے  
 کے لیے صرف دو ناول دوں۔ دونوں ناول  
 جمشید میریز کے ہوں گے۔ گویا اس ماہ کامراض مرزا  
 اور شوکت کا ناول شائع نہیں ہو گا۔ مجھے چاہ کہ  
 بجائے دو ناول لکھنے پڑیں گے اور اس طرح میں پندرہ  
 دہائی آرام کر سکوں گا۔ مجھے امید ہے۔ آپ مجھے  
 پندرہ دہائی کے آرام کے اجازت ضرور دے دیں گے،  
 دیکھیے نا۔ آپ بھی بیمار و بیمار ہو جاتے ہیں۔  
 سکول یا دفاتر سے چھٹ کر لیتے ہیں۔ لیکن۔ مجھے  
 دیکھیے۔ کتنے سال ہو گئے۔ آپ سے کوئی چھٹی نہیں  
 مانگے۔ کام۔ کام۔ اور کام۔ آپ تو ہفتے میں جنے  
 کہ چھٹی بھی کرتے ہیں۔ مجھے تو جنے کے دہائی بھی  
 کام کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں میرے پندرہ دہائی  
 کے رخصت منظور کرنے کے اطلاع ضرور دے  
 دیجیے گا۔ تاکہ میں آئندہ ماہ آپ کے خدمت میں  
 صحت مند ہو کر آ سکوں۔ آپ کے جواب کا  
 انتظار رہے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ۔ دو ناولوں



کہ بجائے رمنہ خامہ نہر کھنا جائے اور ایکہ بلد  
میں ہم دو ناولوں کے برابر مواد آپ کو ملے۔

اس کا ہر ض امکان ہے۔ یقیناً بارے نہیں۔

میرے کچھ قارئین ایسے بھی ہیں جو جانے بوجھ  
کر اپنے خطوط پر پتا نہیں لکھتے۔ اور مطالبہ کرتے  
ہیں کہ میں ان کا خط ناول میں شائع کروں تو  
وہ مانیں۔ ایسے قارئین سے درخواست کروں گا۔

مانیں یا نہ مانیں، جب تک خط پر پتا نہیں ہوگا،  
اس وقت تک اس کو شائع کرنے پر غور نہیں ہو  
سکتا۔ لہٰذا آپ یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ خط کے  
ساتھ پتا نہ شائع کیا جائے۔ یہ ہو سکتا ہے۔

کچھ مخالف لوگ بھی بے پتا خطوط لکھتے ہیں۔  
ان کے خلاف میں اکتفا کرتا ہوں کہ میں بے پتا خطوط  
کے جوابات کس طرح دوں۔ یہ وہ بتا دیں۔

ملکہ حالات بدستور خراب ہیں۔ سب ملکہ کو اللہ سے دعا  
کر رہے کہ ہمارے ملکہ کو استحکام عطا فرمائے۔ خاص طور  
پر کراچی کے حالات بہتر ہو جائیں۔ آمین۔ اس  
سلسلے میں آپ بھی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تعلیمی اداروں  
میں ماحول کو پُر سکون رکھیں۔ اور پُر سکون بنانے

کہ کوشش کرتے رہیں۔ ملکہ دشمن عناصر سے چکنے دیں  
دو باتیں ہیں نصیحت کا پہلو کچھ زیادہ تو نہیں  
ہو گیا۔ اور کہیں آپ بور تو نہیں ہو رہے۔ خیر  
آپ فکر نہ کریں۔ خامہ نہر کے ابتدا آپ کے  
بودیہ کو گدے کے سر سے سینک کے طوطے  
کر دے گا۔ اور جو جو بور آپ آگے بڑھتے  
جائیں گے۔ جبریت اور پسند آپ کو لپیٹ میں  
لیتے چلے جائیں گے۔ اور اس وقت آپ بھول  
چکے ہوں گے کہ بودیہ کس چڑیا کا نام ہے۔  
اب میں اجازت چاہوں گا۔ خطوط کے طوفاغ کا  
سامنا کرنے کے تیار ہیں بھی کرنا ہے نا۔

چاند تارے کے بارے میں جاننے کے لیے آپ  
بہت بے پیڑ ہیں۔ بار بار مجھ سے پوچھا جا رہا  
ہے کہ کب شروع ہو رہا ہے، اس کے لیے کمانیاں،  
مضامین اور دوسری چیزیں ہم ارسال کر سکتے  
ہیں یا نہیں۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے  
کہ اس کے تیار یا نہ نذر شور سے جاری ہیں،  
جو کچھ وقت تو لیں گے۔ بس آپ تھوڑا انتظار  
اور کر لیں، پھر اللہ شاہ اللہ چاند تارے سے ہو گا

اور آپ ہولہ گے۔ رہا مضامین وغیرہ کا ذکر تو  
آپ شوق سے ہر وہ چیز۔ جو آپ لکھ سکتے  
ہیں، لکھ کر ارسال کرتے رہیں۔ ادارت کا  
کام شروع ہو چکا ہے۔ کانٹے چانٹے ہو رہے  
ہے۔ آپ بھی وقت ضائع نہ کریں اور جو تیر  
مارنا ہے، مار گزریں۔ تیر مارنے پر کہیں آپ  
کا منہ تو نہیں بھگیا۔ اچھا بس۔

—

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں۔
  - آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
  - کل آپ کا کوئی شٹ یا استکان تو نہیں۔
  - آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا۔
  - آپ کے فتنے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- اگر ایسے باتو سے بچیں کہ لکھنا باقی ہے جو  
تو اولہ اللہ کے لیے رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے  
کاموں سے غافل نہ ہو لیں۔ پھر ناول پڑھیں۔ شکر ہے!

استیاق احمد



## کھڑے کھڑے

دستک کی آواز سن کر شوکی زور سے اُچھلا، آفتاب کو ایک جھٹکا لگا، اشفاق اور اخلاق کے منہ سے بے ساختہ نکلا :  
"ہائیں ! یہ کیا !"

"تم چاروں پاگل تو نہیں ہو گئے۔ دروازے پر بس دستک ہی تو ہوتی ہے۔ کوئی بم تو نہیں پٹھا۔ ان کی اُمی نے کہا۔  
"نہیں بیگم ! یہ پاگل نہیں ہوئے۔ دروازے پر ضرور کسی خاص آدمی نے دستک دی ہے۔ کیوں بھئی میرا اندازہ درست ہے نا۔" مشتاق احمد خان بولے۔

"بیج۔ جی۔ ہاں ! شوکی نے بشکل کہا اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ تینوں بھی اس کے پیچھے دوڑے تھے۔  
"الٹی خیر۔ آخر ایسا کون خاص آدمی آگیا۔ ان کی والدہ نے

گھبرا کر کہا اور مشتاق احمد خان مسکرا دیے :  
"گھبراؤ نہیں بیگم۔ آنے والا کوئی دشمن ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

## ترتیب

- |                 |                |
|-----------------|----------------|
| ○ کھڑے کھڑے     | ○ چھٹے ٹکڑیاں  |
| ○ کوئی آ رہا ہے | ○ پہیہ گھما دو |
| ○ موت کا میدان  | ○ دھماکے       |
| ○ شرک اور رستہ  | ○ ان کا شکار   |
| ○ برنر          | ○ نصف کامیابی  |
| ○ بڑی چوری      | ○ فائل B-x     |
| ○ گولی کی زبان  | ○ جناب صدر     |
| ○ پاپ لائن      | ○ مشر مجرم     |
| ○ اس کا قاتل    | ○              |



”یہ بات اتنے یقین سے آپ کیسے کر سکتے ہیں۔“ بیگم مشتاق کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میں صرف یہی بات نہیں۔ اور بھی کئی باتیں یقین سے کر سکتا ہوں۔ وہ مسکرائے۔

”اُسی وقت دروازہ کھلا اور ان چاروں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

”ہائیں۔ ہمارا اندازہ تو بالکل درست نکلا۔ یہ تو واقعی آپ لوگ ہیں۔“ آفتاب نے چلا کر کہا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ تم نے یہ خیال نہیں کیا کہ تمہارے سامنے ہمارے بھوت کھڑے ہیں۔“ فاروق کی چمکتی آواز سب کے کانوں میں رس گھول گئی۔

”بھوت کھڑے ہوں ہمارے، ہمارے دشمنوں کے سامنے۔“ فرزانہ نے جل کر کہا۔

”اب دروازے پر ہی مہا بھارت شروع ہو جائے گی۔“ انیسٹر جمشید نے تھلا کر کہا۔

”فکر نہ کریں انکل۔ زیادہ لمبی مہا بھارت نہیں چھڑے گی۔ بس ہم ایک دو باتیں کریں گے اور پھر اندر کا رخ کریں گے۔“ مکھن نے جلدی جلدی کہا۔

”لیکن بھی گزرنے والے ہمیں گھور رہے ہیں۔“ انیسٹر

جمشید نے گہرا کر کہا۔

”گھورنے دیجیے آبا جان۔ گزرنے والوں کا تو کام ہی گھورنا ہے۔“ محمود بولا۔

”ارے تو اندر آ کر باتیں کر لینے میں کیا حرج ہے۔“

اندر سے مشتاق احمد خان کی آواز سنائی دی، پھر وہ اور بیگم مشتاق بھی دروازے کی طرف پلکتے نظر آئے۔

”لیکن شوکی۔ تم چاروں کی حیرت ہمیں خوف زدہ کیے دے رہی ہے۔“ انیسٹر جمشید بولے۔

”لگ۔ کیا۔ مطلب۔ یہ خوف کم بخت یہاں کہاں سے آٹپکا۔ شوکی نے گہرا کر کہا۔

”اس خوف میں بس یہی تو بُری بات ہے۔ موقع بہ موقع ٹپک پڑتا ہے۔“ فاروق بولا۔

عین اُسی وقت ایک اور کار وہاں آ کر رُکی۔ وہ سب کار کی طرف متوجہ ہو گئے اور پھر تو ان کے چہروں پر حیرت کے بادل ہی بادل نظر آئے۔ کار سے انیسٹر کامران مرزا پارٹی اُتر رہی تھی:

”آج ضرور عید کا دن ہے۔ شوکی چلا آٹھا۔

”کیا مطلب؟“ انیسٹر کامران مرزا نے بوکھلا کر کہا۔

”لیکن انکل۔ عید کے دن میں تو ایسی کوئی بوکھلانے

والی بات نہیں ہوتی۔ کمین نے گڑبڑا کر کہا۔  
 "اگر تم یہ جملہ کہو گے۔ تو ضرور ہوگی۔ انپکٹر کامران مرزا  
 نے جلدی سے کہا۔

"اوہ۔ تہ۔ تہ۔ تہ۔ تو کیا۔ انپکٹر جمشید بڑی طرح ہکلاتے۔  
 کیا مطلب۔ کیا۔ آپ بھی۔ انپکٹر کامران مرزا جملہ مکمل نہ  
 کر سکے۔

میں سمجھ گیا۔ اشتقاق نے اعلان کیا۔

کیا سمجھ گئے آپ؟ کمین نے جلدی سے اس کی طرف  
 دیکھا۔

"آج کا دن۔ پسیلیوں میں باتیں کرنے کا ہے۔ وہ بھی  
 دروازے پر کھڑے کھڑے۔"

"اوہ ہاں واقعی۔ اب تو ہمیں فوراً اندر چل کر یہ خوفناک  
 مسئلہ سامنے رکھنا چاہیے۔"

"چلیے۔ اب مسئلے میں خوفناکی بھی شامل ہو گئی۔ شوکی  
 بولا۔

"کچھ پتے نہیں پڑ رہا۔" مشتاق احمد خان بولے۔

"میرا خیال ہے۔ گھبراہٹ میں مبتلا ہونے اور اپنے  
 میزبانوں کو بھی اس میں مبتلا کرنے سے کچھ نہیں ہو سکا،  
 پہلے تو ہمیں ایک دوسرے سے مل لینا چاہیے۔ ایک

دوسرے کو سلامتی کی دعائیں دے ڈالنی چاہئیں۔ پھر اندر  
 چل کر اطمینان سے بیٹھ کر اصل بات بتانی چاہیے۔ انپکٹر  
 جمشید بولے۔

"آئے ابھی آپ لوگ ہیں نہیں۔ اور اصل بات شروع بھی  
 ہو گئی۔ آفتاب گھبرا گیا۔

"خیر۔ آ تو ہم چکے ہیں۔ ان دنوں تمہاری نظر کمزور تو  
 نہیں ہو گئی۔ فاروق نے منہ بنایا۔

آخر انپکٹر جمشید کے مشورے پر عمل کیا گیا۔ جب سب  
 بیٹھ چکے تو وہ بولے:

"تہ۔ تہ۔ شوکی۔ مجھے فون تم نے نہیں کیا تھا۔  
 "م۔ م۔ میں۔ میں نے۔ آپ۔ کو۔ اور فون۔ من۔ نہیں  
 تو۔"

"اور۔ اور کیا ہمیں بھی نہیں کیا تھا؟ انپکٹر کامران مرزا  
 بولے۔

"من نہیں۔ بالکل نہیں۔ جلا میں کیوں آپ کو فون کرتا۔  
 شوکی نے کانپ کر کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ آفتاب  
 نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

”واقعی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔  
 ”سوال تو یہ ہے کہ کیا کیسے ہو سکتا ہے؟ شوکی بولا۔  
 ”مجھ سے فون کرنے والے کی آواز بالکل تم جیسی تھی۔ اور  
 میں ذرہ برابر بھی فرق محسوس کر نہیں سکا۔“  
 ”میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔  
 ”اللہ اپنا رحم کرے۔ اس شہر میں وہ کون ہے۔ جو بالکل  
 مجھ جیسی آواز کا مالک ہے۔“ شوکی نے گھبرا کر کہا۔  
 ”اس کا مطلب ہے۔ کسی شخص نے شوکی کی آواز میں ہم  
 سے کہا ہم فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ آخر وہ کیوں ہم سب کو  
 ایک جگہ جمع کرنا چاہتا ہے۔“ خان رحمان کی آواز ابھری۔  
 ”یہ معاملہ تو شروع سے ہی بہت پُر اسرار ہو گیا۔“  
 ”ذہن صرت پُر اسرار۔ بلکہ خوفناک بھی۔ اس شخص کی مہارت  
 کو ماننا پڑے گا۔ جس نے ہمیں ذرا بھی شک نہیں ہونے  
 دیا۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”مان لیں انکل۔ بے چارہ خوش ہو جائے گا۔“ فاروق مسکرایا۔  
 ”اس کی خوشی کی پڑ گئی احمق کہیں کے۔ اپنا فکدہ کر دو۔“  
 آخر اس نے ہمیں یہاں کیوں جمع کیا ہے۔ آفتاب نے بھتا  
 کر کہا۔  
 ”احمق ہو گئے تم۔“ فاروق نے یک دم اُٹتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے۔ ابھی آپس میں لڑنے کا وقت نہیں آیا۔“  
 پہلے اس کے بارے میں تو غور کرو۔“ انپکٹر جمشید نے گھبرا کر  
 کہا۔ اور فاروق کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔  
 ”وہ یک دم کڑسی پر گرا، لیکن اُسی وقت آفتاب نے کڑسی  
 گھسیٹ لی۔ اور وہ فریٹ پر آ رہا۔“  
 سب کی ہنسی نکل گئی۔ فاروق بھی ہنسنے بغیر نہ رہ سکا۔  
 پھر ہچک کر بولا:

”اس کا جواب تمہیں بہت جلد مل جائے گا۔ ابھی دے  
 دیتا۔ لیکن بڑی پارٹی پسند نہیں کرے گی۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ بذریعہ ڈاک بھیج دینا۔“ آفتاب نے فوراً  
 کہا۔  
 ”بیرنگ آئے گا۔“ فاروق بولا۔  
 سب کے سب ہنسی نہ روک سکے۔  
 ”بھائی اللہ کے لیے۔ ذرا دیر تک چُپ رہو۔ پھر جو تمہارے  
 جی میں آئے کرنا۔ اب ہم ایک جگہ جمع تو ہو ہی گئے ہیں۔“  
 انپکٹر کامران مرزا نے تنگ آ کر کہا۔  
 ”جمع ہو نہیں گئے انکل۔ کیسے گئے ہیں۔ کسی نامعلوم  
 شخص کے ذریعے۔ اور میں یہ جاننے کے لیے بڑی طرح  
 بے چین ہو چکا ہوں کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔“



محمود نے فوراً کہا۔

”عقل استعمال کیے بغیر ہم کچھ معسوم نہیں کر سکیں گے، لیکن یہاں تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہو رہے ہیں۔ آصف نے جل کر کہا۔

”شکر ہے۔ تم بولے تو سہی۔ اب ذرا عقل بھی استعمال کر لو۔“ محمود مسکرایا۔

”ضرور کیوں نہیں۔ لو میری عقل کا پہلا وار سنبھالو۔ آصف نے عجیب سے انداز میں کہا۔

”میں نے سوچنے کی بات کی ہے۔ اور تم عقل کی لڑائی لڑنے لگے۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔ دوسرے مسکرا دیے۔

”سوچنے کا کام فرزند اور فرحت کا ہے۔ اور یہ دونوں آج اس طرح خاموش ہیں جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔“ فاروق بولا۔

”سانپ سونگھ گیا ہو، ہمارے دشمنوں کو۔ تم لوگ کسی دوسرے کو بولنے کا موقع دو تو کوئی بولے بھی۔ اس وقت تک میں اور فرحت بہن کئی بار بولنے کی کوشش کر چکی ہیں۔ لیکن ہر بار تم میں سے کوئی بات اپک لیتا ہے۔“ فرزند نے جل کر کہا۔

”پتا نہیں۔ ان باتوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جب دیکھو۔ اُپکی

جا رہی ہیں۔ اب ایسا بھی کیا اچکا جانا۔“ فاروق نے جھنجھلا کر کہا۔

”مد ہو گئی۔ ہم اس وقت بہت نازک صورتِ حال سے دوچار ہیں اور ان کی اوٹ پٹانگ باتیں دگ ہی نہیں رہیں۔“ انیکٹر کامران مرزا نے پاؤں زور سے پٹخا اور آصف کی چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ اس کے پیر پر ان کا پیر آ گیا تھا۔

”اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔“ فرحت بولی۔

”ضرور۔ کیوں نہیں۔“

”اس شخص نے شوکی کی آواز میں بات کی ہے۔ نہ تو آبا جان پہچان سکے۔ نہ انکل۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس نے پہلے شوکی بھائی کی آواز کو بہت اچھی طرح سنا ہو گا۔ بلکہ کافی دیر تک سنا رہا ہو گا۔ اس کے بعد کہیں جا کر وہ مکمل نقل اتارنے میں کامیاب ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ۔ اس نے ضرور شوکی بھائی سے ملاقات کی ہو گی۔ اب یہ بتانا ان کا کام ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے۔“

”اوہ۔ اوہ۔ شوکی کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

”ہائیں! تو کیا اس کا نام اوہ اوہ ہے۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”خالی پیلی اودہ سے تو کام نہیں چل سکتا۔“ فرحت نے جیسے فاروق کا جملہ سنا ہی نہیں۔

”کل شام۔ ایک صاحب ملنے آئے تھے۔ وہ ایک کیس ہمارے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس بارے میں مجھ سے کافی دیر بات چیت کی تھی اور پھر آج آنے کا وعدہ کر کے پہلے گئے تھے۔ لیکن وہ آئے نہیں۔“

”اور کیا انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتایا تھا؟“

”ہاں بالکل۔ دفتر کے رجسٹر میں اس کا نام اور پتہ موجود ہے۔ کیا میں رجسٹر اٹھا لاؤں؟“

”بھی دفتر میں چلتے ہیں۔ اس بہانے دفتر کی سیر ہو جائے گی۔“ فاروق نے فوراً کہا۔

”لیکن کہیں سیر لمبی نہ ہو جائے۔“ انپکٹر کامران مرزا نے گہرا کر کہا۔

”جی نہیں۔ اتنا لمبا پھوٹا دفتر نہیں ہے۔“ مکھن نے کہا۔

آخر سب دفتر میں آئے :

”یہ۔ یہ دفتر ہے۔“ محمود کا منہ بن گیا۔

”یہ۔ یہ تو چڑیا گھر نظر آ رہا ہے۔ نہیں۔ غلط کر گیا۔“

عجائب گھر نظر آ رہا ہے۔“ آصف نے کہا۔

”نہیں بھئی۔ مجھے تو بہت پسند آیا دفتر۔ ہر چیز سے سادگی

ٹپک رہی ہے۔“ انپکٹر جمشید مکرانے۔

اشفاق نے پُر سکون مسکراہٹ چہرے پر سجا کر سب کی طرف دیکھا، پھر بولا :

”حضور نبی کریم ﷺ نے فضول خرچی سے منع فرمایا ہے۔ بڑی بڑی عمارات بنانا اور ان کی سجاوٹ وغیرہ پر پیسہ لگانا فضول خرچی ہے۔ آپ ﷺ نے بلند و بالا عمارات بنانے کو قطعاً پسند نہیں فرمایا۔“

”ہاں! یہ بات بالکل ٹھیک ہے شوکی۔ ان کا خیال غلط ہے۔ اب وہ رجسٹر نکالو۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

شوکی نے میز کی دراز میں سے رجسٹر نکالا۔ اس کو کھولا اور پھر اس نے کہا :

”ملاقاتی کا نام رشی خان تھا۔ گل رنگ، ہوٹل مکہ نمبر ۲۱۔“

”تب تو ہمیں فوراً ہوٹل گل رنگ پہنچنا چاہیے۔“

”یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ مشتاق احمد خان بولے۔

”کیوں بجائی صاحب۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”آپ لوگ ابھی ابھی آئے ہیں۔ پانی ٹیک نہیں پیا۔ اور جانے کی باتیں کرنے لگے۔“ وہ بولے۔

”ہم صرف گل رنگ ہوٹل تک جا رہے ہیں۔ جلد ہی واپس

لوٹ آئیں گے۔

”آپ کو کیا معلوم۔ لوٹ کر آ سکیں گے یا کہیں آگے بھل جانا پڑے گا۔ مجھے تو معاملہ بہت بڑا سراں لگ رہا ہے۔ آخر کسی کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ آپ سب کو ایک جگہ جمع کرنے کی۔“

”کیا خبر۔ وہ ہم سب سے کوئی کیس حل کرانا چاہتا ہو۔ شوکی یک دم بول اٹھا۔

”اوہ۔ بہت زبردست آئیڈیا ہے۔“ مکھن بولا۔

”لیکن بھئی۔ ہم تمہاری طرح معاوضہ لے کر کیس تو حل نہیں کرتے پھرتے۔ آصف نے مزہ بنایا۔

”ذن میں نے نہیں۔ رشی خان نے کیا ہو گا۔“ شوکی بھی تڑ سے بولا۔

”سنو بھئی۔ ہم نہیں جانتے۔ وہ کون ہے۔ کیا چاہتا ہے۔

لیکن ہے وہ ضرور بڑا سراں آدمی۔ اور میرا خیال ہے۔ بہت چالاک بھی ہے۔ لہذا ہمیں اس سے مقابلے کے لیے پوری طرح چوکٹے ہو جانا چاہیے۔“

”ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔“

”ارے۔ یہ۔ یہ کیا شوکی۔ یہ تمہاری میز پر پھول کیسا پڑا ہے۔“ انیکٹر جمشید کی آواز میں کپکپی تھی۔

”پیچھے۔ پھول۔ جی ہاں۔ پھول ہی تو ہے بس۔“ شوکی گھبرا گیا۔

سب کی نظریں میز پر جم گئیں۔ وہاں ایک زرد اور مرجھایا ہوا پھول دکھا تھا:

”یہ پھول کہاں سے آیا؟“

”کہاں ہے جمشید۔ تم اس مرجھائے ہوئے زرد رنگ کے پھول کے پیچھے پڑ گئے۔ کیا اس میں بھی کوئی عجیب بات ہے۔“ پرو فیسرواد کے لہجے میں حیرت تھی۔

”عجیب بات کی بھی آپ نے ایک ہی کہی انکل۔ وہ تو کوئی بات بھی ہو سکتی ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”تت۔ تم نے۔ بتایا نہیں شوکی۔“ انیکٹر جمشید نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

”جی ہاں! یاد آ گیا۔ یہ پھول اسی ملاقاتی۔ یعنی رشی خان کے ہاتھ میں تھا۔“

”کیا!!“ انیکٹر جمشید خوف زدہ انداز میں چلائے۔



## کوئی آ رہا ہے

اب سب کی نظریں شوکی اور پھول سے ہٹ کر انپکٹر  
جشید پر جم گئیں۔

”جشید۔ تم ایک پھول سے خوف زدہ ہو گئے ہو۔ پروفیسر دادو  
کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”نہیں پروفیسر صاحب۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں۔“ انھوں  
نے کھوٹے کھوٹے انداز میں کہا۔

”کیا کر رہے ہو بھئی۔ خوف تو تمہاری آنکھوں سے بے پناہ  
جھانک رہا ہے۔“ خان رحمان نے بھی حیران ہو کر کہا۔

”میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اس پھول سے خوفزدہ  
نہیں ہوں۔ ہاں جو آدمی پھول لے کر آیا تھا۔ اس سے ضرور  
خوف زدہ ہو گیا ہوں۔“

”لیکن کیوں۔ ابھی تو ہم اس سے ملے بھی نہیں۔“ خان رحمان  
نے کہا۔

”اس زرد پھول کا اس سے خاص تعلق ہے۔“

”کیا! ان کا جملہ سن کر انپکٹر کامران مرزا چلائے۔ ان کی  
آنکھوں میں بھی خوف دوڑ گیا۔“

”یک ذ شد۔ دو شد۔ لیجیے۔ اب تو انکل بھی خوفزدہ  
ہو گئے۔ رہ گئے ہم۔ تو ہم بے چارے ہیں کس گنتی میں۔“  
فادوق نے منہ بنا کر کہا۔

”میرا خیال ہے۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ فوراً ہوش  
گل رنگ پہنچ جانا چاہیے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے۔ وہ وہاں نہیں  
ملے گا۔ لیکن جب تک ہم اپنا اطمینان نہ کر لیں۔ اس وقت تک  
چین بھی تو نہیں آئے گا۔“ انپکٹر جشید جلدی جلدی بولے۔  
”بالکل ٹھیک۔ آئیے چلیں۔“

انھوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اب وہ کس طرح  
رک سکتے تھے۔ وہ بھی دوڑ پڑے۔

”یا اللہ رحم۔ یہ تو پھول کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔“ کنگن نے  
گہرا کر کہا۔

”آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا۔ ابھی تو صرف پھول کا  
ہنگامہ شروع ہوا ہے۔ جہاں ہم سب جمع ہو جائیں۔  
وہاں تو پتھروں کے ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں۔“ آفتاب  
جلدی جلدی بولا۔

دوڑتے ہوئے وہ کاروں تک پہنچے۔ شاق احمد خان دروازے پر ہی رک گئے۔ اور ہانپتے ہوئے بولے:

”میں تو بڑھاپے کی وجہ سے ساتھ نہیں دے سکوں گا۔“  
”کوئی بات نہیں۔ ہم تو پہلے ہی بہت سارے ہیں۔ انپکٹر کامران مرزا نے بلند آواز میں کہا۔

اور پھر ساریں روانہ ہوئیں۔ شوکی کو سب سے اگلی کار میں بٹھایا گیا تھا، کیوں کہ انھیں گل رنگ ہوٹل کا پتا معلوم نہیں تھا۔ اس کار کو انپکٹر جمشید چلا رہے تھے۔ اور انپکٹر کامران مرزا بھی انہی کے ساتھ تھے:

”ہوٹل گل رنگ بڑا ہے یا چھوٹا؟“

”بہت بڑا۔“ گھر شہر کا سب سے بڑا ہوٹل۔“

”یہ رشی خان۔ کیس کیا لے کر آیا تھا؟ انپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

”اوٹ پٹانگ سا کیس تھا۔ میں تو ٹھیک طرح سے سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ پھر اس نے خود ہی اٹھ کر کہا تھا کہ اچھا۔ میں اب کل آکر وضاحت کروں گا۔“

”بس۔ وہ تو دراصل شوکی کی آواز چرانے آیا تھا۔“

”آواز کی چوری۔ بھٹی واہ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو

سکتا ہے۔“ فاروق چمکا۔ ”وہ بھی اسی کار میں تھا۔“

”ہو سکتا ہے تو پھر رکھ لو کسی ناول کا نام۔“ انپکٹر جمشید نے جل کر کہا۔

”مک۔“ کیسے رکھ لوں آبا جان۔ میں مصنف نہیں ہوں۔“  
”بس تو پھر نام بھی کیوں تجویز کرتے ہو؟ انھوں نے بتنا کر کہا۔

”عادت سے مجبور ہوں نا۔ اس لیے۔“ اس نے ہنسی صورت بنائی۔

”دائیں انکل۔ اچانک شوکی بولا۔

”ہماری کار میں تو کوئی دائیں انکل نہیں ہے۔“ فاروق نے گجرا کر کہا۔

”یاد چپ رہو۔ شوکی راستا بتا رہا ہے۔“ انپکٹر جمشید بھٹا اٹھے۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ میں بھی اسے راستا بتا دوں گا۔“  
”اپنے شہر میں بتانا۔ یہاں نہیں۔“ شوکی نے تڑ سے کہا۔  
”یہ۔۔۔ یہ نا انصافی ہے۔“ پھپھلی کار سے آفتاب کی آواز گونجی۔  
”کس نا انصافی کا ذکر کر رہے ہو؟“ فاروق نے مزہ بنا کر کہا۔

”آپ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ جب کہ ہم سن نہیں رہے، اب ہمیں کیا پتا۔ ایسے میں آپ کیا کیا باتیں کر جائیں گے۔“

”تو تم بھی کر دو باتیں اپنی کار والوں سے، روکا کس نے ہے۔“  
 فاروق نے ہنس کر کہا۔

”بہت مشکل ہے۔ آفتاب نے کہا۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ مشکلات کو آسان کرنے والے اللہ تعالیٰ  
 ہیں۔ شوکی بولا، پھر چونک کر اس نے کہا:

”ارے ارے۔ ہم آگے نکل گئے۔ باتیں طرف مڑنا تھا۔“

”حد ہو گئی۔ یہ راستا بتایا جا رہا ہے۔“ فاروق ہل گیا۔  
 آخر وہ ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے اور جلدی جلدی اتر  
 کر ایک جگہ جمع ہو گئے:

”کیا اتنے بہت سے لوگ اندر جائیں گے۔“ پروفیسر داؤد  
 بولے۔

”ہاں کیوں نہیں۔ یہ ہوٹل ہے۔ کسی کا گھر نہیں۔“ خان  
 رحمان بولے۔

”بالکل ٹھیک۔“ انکپٹر جمشید نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔  
 ہوٹل میں داخل ہو کر انکپٹر کامران مرزا نے کاؤنٹر کا

رج کیا اور بولے:

”مکرہ نمبر ۲۰۱ کے مسافر کا نام بتائیں گے آپ؟“  
 ”جی ضرور۔ کیوں نہیں۔“ اس نے کہا۔ فوراً ایک رجسٹر

کھولا اور پھر بولا:

”مسٹر رشی خان۔“

”ہمیں احمی سے ملنا ہے۔“

”لفٹ کے ذریعے۔ تیسری منزل پر چلے جائیں۔ پہلا ہی  
 مکرہ ان کا ہے۔“

”یہ آپ کے ہاں کب سے ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

”چند دن پہلے ہی آئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”لفٹ میں سوار ہو کر وہ اوپر پہنچے۔ مکرہ نمبر ۲۰۱ کا دروازہ

بند نظر آیا۔ محمود نے پہلے تو گھنٹی کا بٹن دبایا۔ پھر جب

نصف منٹ گزر گیا تو دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ بند تھا،

اب اس نے دھک دی، لیکن دروازہ اب بھی نہ کھلا:

”اب کیا کریں؟“

”نیچے سے کسی کو بلانا پڑے گا۔ محمود تم جاؤ۔ اور کاؤنٹر

کلرک کو بلا لاؤ۔“

”جی بہتر۔“ اس نے کہا اور نیچے کی طرف دوڑ گیا۔ وہ

انتظار کرتے رہے۔ آخر کلرک اوپر آ گیا:

”جی فرمائیے۔“

”مسٹر رشی خان کہیں گئے ہوئے تو نہیں ہیں؟“

”ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ کر

دروازے کا ہینڈل گھمایا، پھر اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا:



”جی ہاں! وہ موجود نہیں۔ ضرور کہیں باہر گئے ہیں۔“  
 ”لیکن جناب! ہم انتظار نہیں کر سکتے۔“ انپکٹر کامران مرزا  
 بولے۔

”کیا مطلب؟ کلک چونکا۔“  
 ”آپ ہوٹل والی چابی سے اس کمرے کا دروازہ کھول دیں۔“  
 ”جی ہاں، کسی کے کمرے کا دروازہ کیوں کر کھول سکتا  
 ہوں۔ ہم انہیں کیا جواب دیں گے۔ ہوٹل کا مالک تو مجھے  
 دودھ کی مٹھی کی طرح نکال باہر کرے گا۔ وہ تو پتے ہی  
 بہت سخت آدمی ہے۔“

”اس کے باوجود ہمیں اس کمرے کو اندر سے دیکھنا ہے،  
 کیا ہوٹل کے مالک اس وقت ہوٹل میں موجود ہیں؟“

”ہاں جناب۔ وہ اپنے دفتر میں موجود ہیں۔“  
 ”اب ہمیں ان سے ہی پتہ پڑے گا۔ سب لوگ یہیں ٹھہریں،  
 میں انہیں ساتھ لے کر ان کے پاس جاتا ہوں۔“ انپکٹر کامران  
 مرزا بولے۔

”ان کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں یہیں بلا  
 لیتے ہیں۔“ خان رحمان بولے۔

”اس طرح شاید زیادہ دیر لگ جائے۔“ انپکٹر کامران مرزا  
 بولے۔

”ہوں! ٹھیک ہے۔ آپ ہی چلے جائیں۔“ انپکٹر جمشید نے کہا۔  
 وہ گئے اور مالک کے ساتھ واپس آتے نظر آئے۔ کلک بھی  
 ساتھ تھا اور کافی حیران نظر آ رہا تھا۔  
 ”دروازہ کھول دو جی۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر۔“  
 ”یہ لوگ عام نہیں، خاص ہیں اگر ہم نہیں کھولیں گے تو یہ  
 پولیس کے ذریعے کھولا لیں گے۔“ ہوٹل کے مالک نے کہا۔  
 ”آپ نے ٹھیک کہا مسٹر فرطوس۔“  
 ”مسٹر فرطوس۔ یہ کیسا نام ہے۔“ خان رحمان نے حیران ہو کر  
 کہا۔

”میں غیر ملکی ہوں۔ اس نے فوراً کہا۔“  
 آخر اس کے اشارے پر دروازہ کھول دیا گیا۔  
 ”سب لوگ باہر ہی ٹھہریں گے۔ صحن میں اور انپکٹر  
 کامران مرزا اندر جائیں گے۔“ انپکٹر جمشید نے اعلان کیا۔  
 انہیں دروازے پر رکنا پڑا۔ دونوں اندر گئے اور پھر  
 جلد ہی لوٹ آئے۔

”رشی خان تو یہ کمرہ چھوڑ کر جا چکا ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا نے  
 کلک اور فرطوس کی طرف دیکھا۔  
 ”جی۔ کیا کہا۔ جا چکا ہے۔“ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"ہاں! اس لیے کہ اندر سامان نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔  
 کیا مسٹر رشی خان خالی ہاتھ آئے تھے اس ہوٹل میں؟  
 "جی نہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک بیگ موجود تھا، لیکن میں  
 نے انھیں بیگ لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ابھی تو ہمیں ان  
 سے ہوٹل کا حساب کتاب بھی لینا تھا۔ کلرک نے فوراً کہا۔  
 "اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوا۔ فرطوں نے گھبرا کر کہا۔  
 "خیر۔ اب ہمیں اس کمرے کو بغور دیکھ لینے دیں۔ رشی خان  
 تو جا ہی چکا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"ضرور دیکھیے جناب۔" فرطوں نے کندھے اچکائے۔  
 وہ اندر داخل ہو گئے اور ایک ایک چیز کو بغور دیکھنے  
 لگے۔ لیکن کمرے میں کوئی خاص چیز انھیں نظر نہ آئی۔ ایک  
 دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز پر ایک پیڑ پیڈ ضرور پڑا تھا،  
 انھوں نے پیڈ کا اوپر والا کاغذ اٹھا تو پہلے کاغذ پر یہ تحریر  
 لکھی نظر آئی،

"میں جانتا ہوں، آپ یہاں آئیں گے۔ لیکن میں یہاں  
 سے جا چکا ہوں گا۔ اب میری اور آپ کی ملاقات  
 فرٹی کے میدان میں ہوگی۔"

"فرٹی کا میدان؟ ان کے منہ سے نکلا، چہرے کی نظریں  
 شوکی پر جم گئیں۔ ادھر شوکی کے چہرے پر حیرت ہی حیرت نظر  
 آرہی تھی۔"

"میرا خیال ہے۔ ہمیں گھر چل کر بات کرنی چاہیے۔ شوکی نے  
 کاپیتی آواز میں کہا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔" انپکٹر کامران مرزا بولے۔

"وہ اسی وقت گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سب پر خاموشی  
 طاری ہو چکی تھی۔ جوں ہی گھر پہنچے۔ مشتاق احمد خان نے کہا:  
 "آئی جی نثار احمد صاحب تین مرتبہ فون کر چکے ہیں۔ ان کی  
 ہدایت ہے۔ جوں ہی آپ لوگ آئیں۔ انھیں فون کر لیں۔"

"جی بہتر! انپکٹر جمشید بولے اور پھر فون کی طرف بڑھے ہی  
 تھے کہ گھنٹی بجنے لگی۔ آئی جی صاحب کی آواز سُنتے ہی وہ بولے:  
 "انپکٹر جمشید بول رہا ہوں سر۔ فرمائیے۔ حیرت تو ہے؟  
 "نہیں جمشید۔ فوراً یہاں پہنچو۔ اتنا کہتے ہی انھوں نے ریسیور  
 رکھ دیا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ ان کے چہرے کے آثار دیکھ  
 کر محمود سے رہ نہ گیا۔ فوراً بول اٹھا:  
 "کیا کوئی بُری خبر سنی ہے آپ نے؟"

"ابھی تک تو نہیں سنی۔ لیکن امید یہی ہے کہ ہمیں سننے کی  
 تیاری کر لینی چاہیے۔ آئی جی صاحب نے مجھے فوراً بلایا ہے۔"  
 "اوہ! یہ تو عجیب صورت حال ہو گئی۔" انپکٹر کامران مرزا بولے۔  
 "کیا مطلب؟ وہ چونکے۔

"ایک طرف ہمیں فرٹی کے میدان میں بلایا جا رہا ہے۔ دوسری

طرف دارالحکومت میں۔ اب جائیں تو جائیں کہاں۔

”بہترین حل یہ ہے کہ ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جائیں۔ ایک پارٹی فرٹی کے میدان کا رخ کرے۔ دوسری دارالحکومت کا، ارے۔ مم۔ مگر۔“ فرزانہ ہکلا کر رہ گئی۔

”کیا ہوا۔ کیا ترکیب کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے؟“ فاروق نے گہرا کر کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن مجھے ابھی ابھی ایک خیال سوجھا ہے۔“

”تو پھر یوں کہو۔ آج کا دن خیال سوچنے کا دن ہے۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”اور وہ خیال کیا ہے فرزانہ؟“ انپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

”آپ آئی جی صاحب کو فون کریں۔“

”اوہ۔ اوہ۔“ انپکٹر جمشید اور انپکٹر کامران مرزا کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”یعنی چار اوہ۔“ آفتاب بولا، لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ

نہ دی۔ سب کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ ابھی فرزانہ کی

بات پوری طرح ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن انپکٹر جمشید

اور انپکٹر کامران مرزا ضرور سمجھ چکے تھے۔ انپکٹر جمشید نے جلدی

جلدی آئی جی صاحب کے فہر بلائے اور پھر ان کی آواز سنتے ہی بولے:

”انپکٹر جمشید بول رہا ہوں سر۔“

”کیا حال ہے جمشید۔ بغیر اطلاع کہاں پہنچے ہو تم؟“

”مجھے افسوس ہے سر۔ کہ آپ کو اطلاع نہیں دے سکا۔“

شوکی کا فون ملا تھا کہ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ لہذا فوراً روانہ ہونا پڑا۔ ادھر تو سب خیریت ہے نا۔“

”بب۔ بالکل۔ ایک منٹ جمشید۔ کوئی دوڑ کر آ رہا ہے۔“

”جی۔ کیا فرمایا۔ کوئی دوڑ کر آ رہا ہے۔“ انھوں نے حیران

ہو کر کہا۔

لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ ابھی ریسیور

بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ پھر دوڑتے قدموں کی مدھم آواز ان کے

کاتوں میں آئی۔



## موت کا میدان

"کیا معاملہ ہے جمشید؟ پروفیسر داؤد بے چین ہو کر بولے۔  
 "آئی جی صاحب نے وہ فون ہرگز نہیں کیا تھا۔ ورنہ وہ  
 میرا فون ملنے کے بعد یہ ضرور کہتے۔ اب فون کرنے کی کیا  
 ضرورت پڑ گئی۔ لیکن انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔  
 گویا وہ فون بھی رشی خان نے کیا تھا۔ غضب کی نقل کر لیتا  
 ہے یہ شخص۔ ذرا بھی مجھے محسوس نہیں ہوا کہ آئی جی صاحب  
 کی بجائے کوئی اور بول رہا ہے۔ اور آواز بھی دُور کی تھی۔"  
 "اوہ۔ کمال ہے۔ لیکن آئی جی صاحب بات کرتے کرتے کیوں  
 رک گئے۔"

"ادھر ابھی ابھی کوئی گڑبڑ شروع ہوئی ہے۔ کوئی شخص دوڑ  
 کر آئی جی صاحب کی طرف آیا۔ غالباً کوئی خوفناک خبر لے کر۔"  
 "ہیلو جمشید۔ معاف کرنا۔ میں بات مکمل نہیں کر سکا تھا؛  
 دراصل ابھی ابھی ایک بُری خبر سنی ہے۔ جمشید تم فوراً یہاں

آ جاؤ۔ ارے ہاں۔ میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ ادھر کیا

معاملہ ہے؟

"ابھی تک ہم معاملے کا سر پیر معلوم نہیں کر سکے، لیکن  
 معاملہ مد درجے پراسرار ہے۔ کسی نامعلوم شخص نے شوکی  
 کی آواز میں ہمیں فون کیا کہ فوراً پہنچیں؛ چناں چہ میں اور  
 انیکٹر کامران مرزا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس تک پہنچ گئے؛  
 لیکن یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس نے تو فون کیا ہی نہیں تھا۔  
 "کیا مطلب؟ آئی جی صاحب چونک اٹھے۔

"جی ہاں! اب ہمیں اس آدمی کی تلاش ہوتی۔ جس نے  
 فون کیے تھے۔ ہم نے اس کا نام اور پتہ فوراً ہی معلوم کر لیا،  
 لیکن وہ اسما پتے پر نہیں ملا۔ گھر لوٹے تو معلوم ہوا کہ آپ  
 نے مجھے تین بار فون کیا ہے۔ اور یہ پیغام بھی دیا ہے کہ جوں  
 ہم یہاں آئیں۔ فوراً آپ کو فون کریں۔"

"م۔ میں نے۔ نہیں تو۔ میں نے تو ایسا کوئی پیغام نہیں  
 دیا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔"

"جی ہاں! آپ نے واقعی کوئی فون نہیں کیا تھا۔ وہ فون  
 بھی اسی کا تھا۔ یہی معلوم کرنے کے لیے میں نے آپ کو  
 فون کیا تھا۔ کہ ادھر بھی کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ آخر آپ نے  
 کیا بُری خبر سنی ہے سر؟

”نہیں بھئی۔ فون پر نہیں بتا سکتا۔ یہیں آجاؤ۔ جلدی کرو۔“

”اور۔ یہ معاملہ ہم درمیان میں چھوڑ دیں سر؟“  
 ”ہاں! کوئی بات نہیں۔ یہ معاملہ اتنا بڑا نہیں ہو سکتا۔  
 جتنا کہ اس طرف والا۔ لہذا سب لوگ یہیں آ جائیں۔“  
 ”لیکن سر۔ ہم سب کس طرح آ سکتے ہیں۔۔۔ اس  
 نے ہمیں ایک میدان میں لٹکارا ہے۔“

”اس نے۔ کس نے۔ اوہ۔ کیا اسی نامعلوم آدمی نے۔“  
 ”جی ہاں! وہ بولے۔“

”حیرت ہے۔ آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟“  
 ”ابھی تک ہم نہیں جان سکے۔ ان حالات میں آپ ہمیں  
 دارالحکومت پہنچنے کا حکم دے رہے ہیں۔ ہم کریں تو کیا۔“  
 ”ہاں! تم لوگوں کو آنا ہی پڑے گا۔ انپکٹر کا مران مرزا  
 کو بھی اور شوکی کو بھی۔ میں کہتا ہوں جشید۔ اس نامعلوم  
 آدمی کو فی الحال بھول جاؤ۔ اس کی وجہ سے ہمارا کوئی  
 نقصان نہیں ہوا۔ کوئی حرج نہیں ہوا۔ اس سے تو بعد  
 میں بھی بٹھا جا سکتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں یہی کرنا ہو گا۔“  
 ”بہت بہت شکریہ جشید۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”انہوں نے ریسور دکھ دیا۔ عین اسی وقت فون کی گھنٹی  
 بجی۔ وہ چونک اٹھے اور پھر ریسور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے  
 انہیں خود اپنی آواز سنائی دی :  
 ”انپکٹر جشید بول رہا ہوں۔“  
 ”کیا مطلب؟ انپکٹر جشید چونکے۔“

”بہادر میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں کرتے۔ فرٹی کا میدان  
 چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں نا آپ۔“  
 ”انپکٹر جشید ساکت رہ گئے۔ تو اسے یہ بات بھی معلوم  
 ہو چکی تھی۔ اچانک انہیں ایک بہت زوردار خیال آیا۔  
 ان کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ وہ پُرسکون آواز میں بولے :  
 ”نہیں دوست۔ ہم فرٹی کے میدان میں ضرور آئیں گے،  
 لیکن میں جانتا ہوں۔ آپ وہاں نہیں ہوں گے۔“  
 ”نیں اور وہاں نہ ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف  
 سے چلا کر کہا گیا۔ اس حالت میں بھی آواز ان کی ہی اس  
 کے منہ سے نکلی تھی۔“

”تب پھر۔ آپ ہوٹل گل رنگ میں کیوں نہیں ٹھہرے؟“  
 ”چھوٹی جگہ تھی۔ اور آپ لوگ زیادہ تعداد میں آتے تھے۔ اگر  
 صرت آپ آتے تو میں اس کمرے میں ضرور ملتا۔ لیکن ایسی بات  
 نہیں کہ میں اس وقت ہوٹل گل رنگ میں نہیں تھا۔“

”کیا مطلب؟ وہ زور سے چونکے۔

”میں وہیں تھا۔ آپ لوگوں سے چند قدم کے فاصلے پر۔  
آپ کی سادی کا ردوائی دیکھ رہا تھا۔“

”ہوں! لیکن مشر۔ رشی خان۔ آپ کی ان حرکات کا  
مطلب کیا ہے؟“

”ملاقات پر ہی بتا سکتا ہوں۔ لیکن۔ آپ ملاقات کے  
لیے کہاں آئیں گے۔ آپ تو ڈر گئے ہیں مجھ سے۔“

”ہم آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ انپکٹر  
جمشید بولے اور پھر دوسری طرف سے یہ کہ کر ریسپور رکھ دیا گیا:

”اچھا۔ میں انتظار کروں گا۔“

انھوں نے ریسپور رکھ دیا اور ان کی طرف مڑے:

”رشی خان تھا فون پر اور میری آواز میں بات کر رہا تھا۔“

”اوہ۔ گویا یہ شخص آوازوں کی نقل اتارنے کا ماہر ہے۔“

”ہاں۔ یہی کہا جا سکتا ہے۔“

”سوال یہ ہے کہ کیا کیا جاتے۔ وہ ہمیں فرٹی کے میدان

میں بلانے پر تیار ہوا ہے۔ اور ادھر آئی جی صاحب چاہتے

ہیں کہ ہم دارالحکومت پہنچ جائیں۔“

”اوہ۔ اوہ۔“ فرحت چلائی۔

”پھر دو مرتبہ اوہ۔ اوہ۔ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔“

خان رحمان گھبرا گئے۔

”یہی رشی خان کا پروگرام ہے۔“

”کیا مطلب؟ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔“

”اس نے شوکی بھیا کی آواز میں ہمیں یہاں جمع کیا اور

الحجین میں ڈال دیا۔ اور اب جب کہ ہمیں دارالحکومت میں

بلایا جا رہا ہے۔ تو وہ چاہتا ہے، ہم فرٹی کے میدان

میں پہنچ کر اس سے دو دو ہاتھ کر لیں۔ وہ ہمیں لٹکار

رہا ہے۔ تاکہ ہم دارالحکومت نہ جاتیں۔ جوش میں آ کر

اس کا رخ کریں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب ہم کیا

کریں۔“

”ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ جوش میں آ کر ہوش کھو

دیں۔ لیکن اس وقت ضرورت ہے حکمت عملی کی۔ انپکٹر کامران

مرزا نے فکر مندہ انداز میں کہا۔

”جی۔ کیا مطلب؟ خان رحمان چونکے۔

”فرض کریں۔ ہم دارالحکومت چلے جاتے ہیں۔ تو کیا رشی

خان ہمیں رہ جائے گا۔ وہ بھی ادھر کا رخ کرے گا۔ یہ

بات نہیں کہ ہم اس سے ڈر گئے ہیں۔ نہیں۔ بلکہ ہمیں

ایسا قدم اٹھانا چاہیے کہ اس کی چال کا جواب چال سے

دے سکیں۔ لہذا ہم میں سے ایک پارٹی فوراً فرٹی کے



میدان کا رُخ کرے گی۔ فوٹی کے میدان کا رُخ کرنے والی پارٹی اس کا مقابلہ کرے گی۔ تاکہ اسے دارالحکومت تک پہنچنے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔ اور دوسری پارٹی جا کر دارالحکومت والا معاملہ سنبھالے گی۔ پہلی پارٹی فارغ ہوتے ہی دارالحکومت کا رُخ کرے گی اور دوسری پارٹی ایک پہنچ جائے گی۔ یہاں تک کہ انپیکٹر کامران مرزا خاموش ہو گئے۔

”میرا خیال ہے۔ ان حالات میں اس سے بہتر ترکیب کوئی نہیں ہو سکتی۔“ انپیکٹر جمشید نے کہا۔

”لیکن اس طرح ہم دو حصوں میں تو تقسیم ہو ہی جائیں گے۔“ خان رحمان بولے۔

”مجبوری ہے خان رحمان۔ دشمن چاہتا ہے۔ ہمیں اس شہر میں الجھائے رکھے۔ اور ہماری خاص ضرورت دارالحکومت میں ہے۔“ انھوں نے کہا۔

”ہوں۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ یوں ہی سہی۔ اب ان تین پارٹیوں کو دو میں تقسیم کرنے کا کام رہ جاتا ہے۔ اور جمشید۔ یہ کام تم بہتر طور پر کر سکو گے۔“ وہ بولے۔

”یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ آدھے ایک طرف ہو جائیں۔ آدھے ایک طرف۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

وہ جلدی میں دو حصوں میں بٹ گئے۔ وہ کل چودہ

تھے۔ انپیکٹر جمشید کے حصے میں فاروق، آفتاب، مکھن، پروفیسر داؤد، اخلاق اور فرحت آئے اور انپیکٹر کامران مرزا کے حصے میں محمود، آصف، شوکی، اشفاق، خان رحمان اور فرزانہ آئے۔ انپیکٹر جمشید پارٹی فوری طور پر بذریعہ جہاز دارالحکومت روانہ ہو گئی اور انپیکٹر کامران مرزا نے شوکی کی رہنمائی میں فوٹی کے میدان کا رُخ کیا:

”یہ میدان کتنی دُور ہے شوکی؟ کار ڈرائیو کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

”یہاں سے صرف تیرہ کلومیٹر۔ لیکن اس میدان کا کوئی دن میں بھی رُخ نہیں کرتا۔“ شوکی نے گھبرا کر کہا۔

”کیوں؟“ وہ بولے۔

”اس لیے کہ جو بھی اس طرف جاتا ہے۔ دوسرے دن اس کی لاش ہی شہر والوں کو ملتی ہے۔“

”کیا مطلب۔ کیا پولیس نے اس میدان کی طرف آج تک توجہ نہیں دی۔“

”پولیس والے جب میدان کا رُخ کرتے ہیں تو انھیں کچھ بھی نہیں ملتا۔ کوئی انسان دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔“

”کیا یہ میدان چٹیل ہے؟“

”جی نہیں۔ اس میں جگہ جگہ ٹیلے ہیں اور تو دے بھی ہیں،

ان پر خود رو پودے آگے ہوئے ہیں۔ گویا یہ سرسبز ٹیلوں کا میدان ہے۔

”ہٹوں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرف جانے والا زندہ کیوں لوٹ کر نہیں آتا۔“

”یہ راز آج تک نہیں کھل سکا۔ وہ بڑ بڑایا۔“  
”کبھی تم لوگوں نے بھی کوشش نہیں کی؟“ محمود نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہم۔ یعنی کہ ہم۔ اور اس میدان کا رخ کرتے۔ ہماری تو اس میدان کا نام سن کر ہی جان جاتی ہے۔ اشتقاق نے گہرا کر کہا اور وہ مسکرا دیے۔“

”میں منٹ بعد وہ فرٹی کے میدان میں پہنچ گئے۔ میدان کی مدد شروع ہوتے ہی شوکی بول اٹھا:

”بس اگل۔ ہم پہنچ گئے۔ اور میرا خیال ہے، ہمیں یہیں اتر جانا چاہیے۔ رشی خان نے آگے ز جانے کیا چکر چلایا ہوا ہو گا۔“

”میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ شوکی۔ تم تو فوج میں بھی نام پیدا کر سکتے ہو۔“ خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

”جی کیا کہا۔ فوج میں۔ ارے باپ رے۔“ وہ کانپ اٹھا۔  
ادھر انپکٹر کامران مرزا میدان پر نظر ڈال رہے تھے۔ باقی

بھی اس طرف متوجہ ہو گئے:

”خطرناک۔ بلکہ بہت خطرناک۔“ انپکٹر کامران مرزا بڑ بڑائے۔  
”کیا چیز خطرناک۔ ہم لوگ۔ یا فرٹی کا میدان۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔

”فرٹی کا میدان۔ ہمارے لیے۔ آپ کا کیا خیال ہے خان رحمان؟“  
”ہم آگے بڑھ کر موت کو آواز دے ڈالیں گے۔ یہ میدان فرٹی کا نہیں۔ موت کا میدان ہے۔“ خان رحمان نے گویا اعلان کیا۔

”تو پھر۔ کیا ہم یہیں سے لوٹ جائیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اگل۔“ آصف نے منہ بنا کر کہا۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ ہمیں یہیں سے لوٹ جانا چاہیے، میں نے تو بس یہ کہا ہے کہ آگے بڑھنا اور موت کو گلے لگانا ایک ہی بات ہے۔ ٹیلے سرسبز ہیں۔ ان پر درخت بھی ہیں اور پودے بھی۔ جھاڑیاں بھی ہیں اور بیلین بھی۔ ان میں سے کس ٹیلے کے پیچھے دشمن چھپا ہے۔ ہم نہیں جانتے۔ اب سوال یہ ہے کہ آگے بڑھیں تو کیسے؟ خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔  
سب سوچ میں ڈوب گئے۔ ایسے میں فرزانہ بولی:

”ہم اس میدان کے کنارے پر رہتے ہوئے ایک چکر کیوں دکھائیں۔“

"اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمارے پکڑ کاٹنے کے ساتھ ساتھ دشمن کے چپے ہوتے آدمی بھی پکڑ کاٹیں گے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ وہ ٹیلوں کے گرد پکڑ کاٹیں گے اور ہم میدان کے گرد۔ ہمیں بہت فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ جب کہ انہیں چند قدم۔ ہم ہر وقت ان کی زد میں ہوں گے۔ اور ان میں سے ایک بھی ہماری زد میں نہیں ہوگا۔ ہمارے چالاک دشمن نے اس میدان کا انتخاب کچھ سوچ کر ہی کیا ہے، وہ ہمیں بُری طرح بے بس کر دینا چاہتا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم سب ادھر نہیں آگئے۔ کم از کم ہم میں سے نصف تو دارالحکومت چلے ہی گئے۔"

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ یہ چیلنج ایک دھوکا ہے، اس نے دھوکے سے ہمیں یہاں بلانے کی کوشش کی ہے۔ شوکی بڑبڑایا۔

"ہاں! یہی کہا جاسکتا ہے، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"وہ سوچ میں ڈوب گئے، لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا،

"ان حالات میں انکل نمان رحمان ہی کوئی ترکیب بتا سکتے ہیں۔ محمود بولا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ خان رحمان بولے۔

موجی کیا مطلب؟ وہ چونکے۔

"یہ ٹھیک ہے۔ ان حالات میں میں کوئی ترکیب بتا سکتا ہوں۔ وہ مسکراتے۔

"تو پھر بتائیے نا انکل۔ انتظار کس بات کا۔ آصف بولا۔

"ہم بہادرانہ تدبیرات کو پرے دھکیل دیں۔ اور بزدلوں کی طرح

یہاں سے پیچھے ہٹتے چلے جائیں۔ ہر وقت اور ہر جگہ بہادری

نہیں دکھائی جاسکتی۔ عقل مند کمانڈر اپنی فوج کو ہر حالت

میں بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے اسے پیچھے ہی کیوں

نہ ہٹنا پڑے۔ لہذا میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہم پیچھے ہٹ جائیں،

آخر اس میں ہمارا نقصان کیا ہے؟

"میں آپ کی تجویز سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔ انپیکٹر کامران

مرزا نے فوراً کہا۔

"لیکن ہمارا اتفاق کرنا بہت مشکل ہے انکل۔ آصف نے

منہ بنایا۔

"تم پر تو ہر وقت ہیرو بننے کا سبھوت سوار رہتا ہے۔"

انپیکٹر کامران مرزا نے منہ بنایا۔

"یہ بات نہیں انکل۔ ہم چاہتے ہیں۔ جب بھی اس کیس

کے دوران رشی خان سے ہمارا سامنا ہو۔ وہ ہمیں کوئی طعنہ نہ

دے سکے۔ محمود نے کہا۔



”جی طعنہ دے گا نا۔ تو دینے دینا۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔“  
انپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

”جو آپ کا حکم۔ اب ہم آپ کے حکم کے خلاف تو قدم نہیں اٹھا سکتے۔ آصف بولا۔

”شکریہ۔ اب رُخ موڑے۔ بغیر پیچھے ہٹنا شروع کر دو۔  
ہم اپنی گاڑیوں تک اسی طرح جائیں گے اور پھر گاڑیوں میں بیٹھ کر تیر کی طرح شہر کا رُخ کریں گے۔ ہم پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکے ہیں۔ لہذا فوراً دارالحکومت کا رُخ کریں گے۔“

”اور رشی خان۔ وہ۔ وہ تو وہ گیا سمجھو۔“

”بھائی ہم رشی خان کے لیے جلا کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے راستے میں آئے گا تو دیکھ لیں گے اسے بھی۔ دیکھا جائے تو اس نے ابھی تک ہم سے بس اتنی ہی چال چلی ہے کہ ہمیں اس شہر میں اکٹھا کر دیا اور پھر یہاں آنے کے لیے چیلنج کر ڈالا۔ اور بس۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں کیا، لہذا ہم کیوں نہ زیادہ اہم کام کی طرف توجہ دیں، ہو سکتا ہے، انپکٹر جمشید پارٹی ہماری کمی محسوس کر رہی ہو۔ انپکٹر کامران مرزا نے جلدی جلدی کہا۔

”گویا آپ نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ہاں! یہی میرا فیصلہ ہے۔ یہی خان رحمان کا۔“ وہ بولے۔  
”تو پھر چلیے۔“

وہ پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ گاڑیوں کے پاس پہنچ گئے۔ اب جو انھوں نے گاڑیوں میں بیٹھ کر انھیں اشارت کرنے کی کوشش کی تو دونوں گاڑیوں نے اشارت ہونے سے انکار کر دیا:

”ہائیں! یہ گاڑیوں کو کیا ہو گیا؟ خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔  
”ایک کو کچھ ہوا ہوتا تو دوسری اشارت ہو جاتی تو اور بات تھی۔ دونوں کا اشارت نہ ہونا میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔“ فرزانہ نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

”اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ ہم نے دشمن کی ذہانت کے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ وہ ہرٹ اس میدان پر قابض نہیں۔ میدان کے آس پاس بھی اس نے جال بچھا رکھا ہے۔“ خان رحمان بڑبڑاتے۔

”ہاں! میں بھی یہ بات محسوس کر چکا ہوں، لیکن مشکل تو یہ ہے کہ دشمن یا اس کا کوئی آدمی اب تک ہمیں نظر نہیں آسکا۔“ اور انھیں نظر آنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ نظر آئے بغیر کام جو چل رہا ہے ان کا۔ آصف نے ہنسا کر کہا۔

”میں اسی وقت کوئی چیز سننا ہی ہوئی ان کے اوپر گری۔“

انہیں یوں لگا جیسے تیر چلایا گیا ہو۔ وہ ایک دم زمین پر گرے۔ اور پھر ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ گرنے والی چیز سیاہ رنگ کا کوئی تیر نہیں۔ ایک پھیر سانپ تھا۔ گرتے ہی اس نے اپنا پھن اٹھا دیا۔ سانپ شوکی کے سب سے زیادہ نزدیک تھا، اس کے پھن اور شوکی کے منہ کے درمیان صرف ایک ڈیڑھ میٹر کا فاصلہ تھا۔ شوکی کے بدن میں تھر تھری دوڑ گئی :

”ارے باپ رے۔۔۔ یہ تو بالکل اصلی سانپ ہے۔“ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

”اب یہاں وہ نقلی سانپ کہاں سے لاتے۔ آصف نے منہ بنایا۔ اس وقت مسد تھا شوکی کی جان بچانے کا۔ لیکن جوں ہی کوئی سانپ کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا۔ وہ شوکی کو ٹوس لیتا، شوکی بس اس وقت تک ہی اس کے وار سے محفوظ تھا جب تک کہ وہ یا کوئی دوسرا حرکت نہ کرتا۔ دوسری طرف وہ آخر کب تک اپنی جگہوں پر ساکت رہتے۔ آخر انیکٹر کامران مرزا نے غیر محسوس طور پر پستول جیب سے نکالا۔

”احتیاط سے انکل۔ اگر نشانہ چوک گیا تو شوکی بھائی بھی گئے اس دنیا سے۔“ آصف نے گھبرا کر کہا۔

”ارے باپ رے۔ شوکی کا پنا۔

”میں سمجھتا ہوں آصف۔ فکر نہ کرو۔ ہاں میرے لیے دعا کرو،

فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ دعا کرنے میں بہتری ہی بہتری ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے ٹریگر دبا دیا۔ سب نے سانپ کا سر غائب ہوتے دیکھا۔ اس کا دھڑا چلا اور بل کھانے لگا :

”وہ مارا۔ دشمن کا پہلا وار ہم نے خالی دیا۔“ محمود چلا دیا۔

”لیکن یہ خاموش جنگ بہت خطرناک ہے۔ دشمن کی چالاک نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ ذاب تک وہ خود سامنے آیا۔ ذاب اس کا کوئی آدمی ہم نہیں جانتے۔ وہ کس جگہ موجود ہیں۔ ہم تو سانپ کے آنے کا رخ تک نہیں جان سکے۔“ خان رحمان بڑبڑاتے۔

”اور خان رحمان۔ میں سوچ رہا ہوں اگر ایسے۔“

”اُن کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اس مرتبہ سناہٹ کی کئی آوازیں گونجی تھیں۔“

## ٹوک اور رسہ

آئی جی نثار احمد نے ان سب پر ایک نظر ڈالی اور پھر بولے:

”آپ لوگوں کی ترتیب کچھ گڑبڑ نظر آرہی ہے۔“  
 ”جی ہاں! اس لیے کہ تین پارٹیوں کی پہلے دو پارٹیاں بنیں،  
 پھر اس میں سے صرف ایک پارٹی نے ادھر کا رخ کیا۔  
 دوسری ابھی وہیں مصروف ہے۔“ فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ لوگ وہاں اچانک پہنچ گئے۔ تفصیل سنائیں گے۔“  
 وہ بولے۔

”جی ہاں! ضرور۔ کیوں نہیں؟“ انیکٹر جمشید نے کہا اور تفصیل

سنا دی۔  
 ”ہمیں! یہ معاملہ بھی کچھ کم پُر اسرار نہیں ہے، لیکن یہاں  
 جو واقعہ پیش آیا ہے۔ وہ کچھ زیادہ حیرت انگیز ہے۔“  
 ”آپ فکر نہ کریں سر۔ ہم اس کی حیرت انگیزی کم کرنے

کی پوری پوری کوشش کریں گے۔“ آفتاب نے فوراً کہا۔  
 ”وہ مسکرا دیے۔“ انیکٹر جمشید کا منہ بن گیا۔ انہوں نے  
 فاروق اور آفتاب پر ایک تیز نظر ڈالی۔ ایسے میں آئی جی  
 صاحب بولے:

”بہتر یہ ہوگا کہ میں آپ لوگوں کو جائے واردات پر  
 ہی لے جاؤں۔“

”آپ کیوں تکلیف کریں گے سر۔ ہمیں تفصیل بتا دیں۔  
 خود ہی وہاں چلے جاتے ہیں۔“

”نہیں بھئی۔ مجھے ہی جانا ہوگا۔ آئیے چلیں۔“  
 ایک وگن میں بیٹھ کر وہ وہاں سے روانہ ہوئے:  
 ”ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہمیں کافی لمبا سفر کرنا ہے۔“  
 انیکٹر جمشید بڑبڑائے۔

”ہاں جمشید۔ قریباً چالیس کلومیٹر تو ضرور سفر کریں گے ہم۔“  
 ”گو یا شہر سے باہر جانا ہے۔“ وہ بولے۔

”ہاں! انہوں نے فوراً کہا۔“  
 ”اور کیا ہم۔ جنوبی سڑک پر سفر کریں گے؟ وہ جلدی سے  
 بولے۔“

”تت۔ تو تم سمجھ گئے جمشید۔“ آئی جی صاحب کے لہجے میں  
 بلا کی حیرت تھی۔



”صرف اندازہ لگا پایا ہوں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ آپ نے چالیس کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بارے میں بتا دیا ہے، اور ہمارے شہر کی چاروں اطراف میں سے چالیسویں کلومیٹر پر صرف جنوبی سمت میں ایک اہم مقام ہے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔ تمہاری ذہانت کو ماننا پڑتا ہے جمشید۔“

”شکریہ سر۔ اس میں ذہانت کی بات نہیں۔ وہ مسکرائے۔

”لیکن ہمارے پتے کچھ نہیں پڑا آبا جان۔ اور ہماری الجھن ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔“ فاروق نے بے چین ہو کر کہا۔

”الجھن نہ ہوئی بڑھ ہو گئی۔“ آفتاب نے اسے گھوہرا۔

”ہائیں۔ تو کیا تمہاری الجھن جوں کی توں موجود ہے۔“ فاروق بولا۔

”ہے ہی نہیں سرے سے۔ ہوگی تو گھٹے بڑھے گی نا۔“

”کھن نے شوخ لہجے میں کہا۔

”تت۔ تم بھول رہے ہو۔ ہمارے درمیان شیخ صاحب بھی موجود ہیں۔“ انپکٹر جمشید نے گہرا کر کہا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ آج شیخ صاحب بھی ہماری باتوں سے لطف اندوز ہو لیں گے۔“ فاروق نے بے خوف ہو کر کہا۔

”خرد بھئی۔ کیوں نہیں۔“ وہ فوراً بولے۔

”انہیں کھلی چھٹی نہ دیں سر۔ سر پر چڑھ جائیں گے۔“ انپکٹر جمشید نے گویا خبردار کیا۔

”پتلے خیر۔ ہند چھٹی دے دیں۔“ فرحت مسکرائی۔

”دیکھا آپ نے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”ہاں جمشید۔ دیکھ چکا ہوں اور سن بھی چکا ہوں۔ میں انہیں اس سفر کے دوران کھل کر بات چیت کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔“

”ارے ارے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو ہو جائیں گے شیر۔“ انپکٹر جمشید بوکھلا اٹھے۔

”لیکن آبا جان۔ گیدڑ تو ہم پہلے ہی نہیں ہیں۔“ فاروق چمکا۔

”رہنے دو جمشید۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔“ پروفیسر داؤد مسکرائے۔

”ہاں اور کیا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آیا کرتا، یہ تو آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے۔ اور نہ زبان سے نکلی ہوئی بات۔“ آفتاب مسکرایا۔

”ہاں! بہت اچھی طرح۔“ انپکٹر جمشید جیسے کٹے انداز میں بولے۔

”آخر حرج بھی کیا ہے جمشید۔ سفر ہی تو طے کر رہے ہیں۔“ آئی جی مسکرائے۔

”دماغ چاٹ جائیں گے سر۔“ وہ بولے۔

”کوئی بات نہیں۔ آج میں ان سے دماغ چٹوانے کے سڑ  
میں ہوں۔“ آئی جی بولے۔

”وہ مارا۔ اسے کہتے ہیں بالکل اصلی چٹنی۔“ فاروق نے  
نعرہ مارا۔

”لیکن جھٹی۔ یہ بالکل اصلی چٹنی جی نصف ہی ہے۔“  
فرحت نے فوراً کہا۔

”نصف کیسے۔ کیا تمہارے کان خراب ہو گئے ہیں۔“  
آئی جی انکل نے پوری چٹنی دی ہے۔“ فاروق نے اسے گھورا۔

”آپ فرحت بہن کا مطلب نہیں سمجھے۔“ اعلاق بول اٹھا۔  
”اوہو۔ تو اب آپ مطلب سمجھیں گے۔ ذرا ہم بھی تو سنیں

مطلب۔“ آفتاب نے طنز یہ لہجے میں کہا۔  
”مطلب یہ کہ۔ ہمارے نصف ساتھی ہمارے ساتھ نہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔ میرا یہی مطلب تھا۔“ فرحت نے فوراً  
کہا۔

”اوہ! فاروق اور آفتاب کے منہ سے نکلا۔  
”کیوں۔ منہ کی کھائی نا۔“ مکھن نے انہیں چڑایا۔

”چلو خیر۔ کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی منہ کی کھانا لگتی شکر کھانے  
کے برابر ہوتا ہے۔“ فاروق نے جھینپ کر کہا۔

”اب شروع ہوئی۔ بال کی کھال اترنا۔ آپ ملاحظہ فرما  
رہے ہیں۔“ انیکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

”بلکہ میں خوب لطف لے رہا ہوں۔“  
”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

”بس جمشید۔ اب تم اس سیلاب کے آگے بند نہیں باندھ  
سکتے۔“ پردیسر مسکرائے۔

”آپ لوگ جو ان کا ساتھ دینے پر تمل گئے ہیں۔“  
”بلکہ تمل کیا گئے ہیں۔ یوں کہیں۔ ساتھ دینے کے لیے

ادھار کھائے بیٹھے تھے۔“ فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔  
”محاورات کی اس قدر فضول خرچی تو نہ کرو۔ ایک جملے میں

تین محاورے۔“ آفتاب نے اسے گھورا۔  
”کاٹ کھانے کو نہ دوڑو۔ میری طرف سے تم ایک جملے میں

چار چار محاورات ٹھونس لو۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“  
فاروق تڑپ سے بولا۔

”لیکن! محاورات پر تو ظلم ہوگا۔“ فرحت بولی۔  
”آئیں بڑی محاورات کی ہمدرد۔ اگر اتنی ہی ہمدردی ہے

ان سے تو ان کا بیمہ کراؤ۔“ فاروق نے مشورہ دیا۔  
”کیا کہا۔ محاورات کا بیمہ۔“ آفتاب نے کھوٹے کھوٹے انداز میں

کہا۔

”اوہ ہاں۔ واقعی۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔  
خیر۔ فکر نہ کرو۔ کسی مصنف کو تجویز کے طور کچھ بھیجوں گا۔  
فادوق نے کہا۔

”مصنف بے چارے تو جیسے تمھاری تجاویز کے محتاج  
ہیں نا۔ فرحت نے منہ بنایا۔

”کاش۔ اس وقت دوسری پارٹی بھی یہیں ہوتی اور پھر ملی  
ہوتی یہ کھلی چٹھی۔ اُف گتنا مزہ آتا۔“

”مزے کے ساتھ اُف نہیں۔ واہ بولا جائے تو بہتر رہے  
گا۔“ اخلاق نے فوراً کہا۔

”لیجئے۔ اب اُردو گرامر کا پیریڈ شروع ہو گیا۔ ہے کوئی ٹیک۔  
”تو کیا اُردو گرامر بے ٹکی چیز ہے۔“ انیسٹر جمشید حیران ہو  
کر بولے۔

”جی نہیں۔ وہ تو بہت ٹیک کی چیز ہے، لیکن اس کو یاد  
کرنا ذرا بے ٹکی سی بات ہے۔ دماغ خالی ہونے لگتا ہے۔“  
آفتاب نے منہ بنایا۔

”چلو شکریہ ہے۔ تم دوسروں کا دماغ خالی کرتے ہو۔ کوئی  
تو چیز ہے۔ جو تم سے بھی ٹکرا جاتی ہے۔“

”ٹکرانے کی بھی ایک ہی کمی۔ فرزانہ کو بھی الجبرا ٹکرا جاتا ہے۔“  
فادوق مسکرایا۔

”اور خود تمہیں حساب۔ محمود کو جغرافیہ۔ آفتاب نے ہنسا کر کہا۔  
”ہائیں۔ کیا آپ لوگوں نے ایک ایک مضمون کا ٹھیکا لے  
رکھا ہے۔“ مکمن کے لہجے میں حیرت تھی۔  
”میں ٹھیک کر رہا تھا نہ سر۔ اب آپ ان کی باتوں سے پریشان  
ہو رہے ہیں نا۔“

”تمھارا اندازہ بالکل غلط ہے جمشید۔ وہ بولے۔  
”وہ مارا۔ اسے کہتے ہیں کھلی چٹھی پر ایک اور کھلی چٹھی۔“  
فادوق بولا۔

”تو یوں کہو نا۔ چٹری اور دو دو۔“ پروفیسر دادو بولے۔  
”یہ محاورہ ذرا بوڑھا سا ہو گیا انکل۔ اب کہاں رواج رہا  
چٹری روٹیاں کھانے کا۔ وہ بھی ایک ایک نہیں۔ دو دو۔“  
فرحت مسکرائی۔

”تو بھئی۔ میں بھی تو بوڑھا ہو گیا ہوں۔“ پروفیسر دادو  
نے کہا۔

”ہائیں۔ یہ کیا۔ کباب میں ہڈی تو نہیں آگئی۔“ ایسے  
میں فرحت بلند آواز میں بولی۔

”کباب۔ کہاں ہیں کباب؟“ پروفیسر دادو جلدی سے بولے۔  
”یہ محاورے والے کباب کی بات ہو رہی ہے پروفیسر صاحب۔“  
انیسٹر جمشید مسکرائے۔



لیکن میری تو جھوک چمک اُٹھی ہے! انھوں نے پریشان ہو کر کہا۔

فرحت کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر سب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں سڑک پر دیکھا۔ سڑک کے درمیان میں ایک رستہ اس طرح بانٹھا گیا تھا کہ ان کی دیکھ اس سے ٹکرائے بغیر گزر نہیں سکتی تھی۔

خطہ! انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا اور پھر انھوں نے پورے بریک لگائے۔ لیکن رستہ چونکہ ایک موڑ مڑنے کے فوراً بعد نظر آیا تھا۔ اس لیے وہ رستے سے زیادہ فاصلے پر نہیں رک سکے تھے، لیکن دوسرے ہی لمحے انھوں نے بھی تیزی دکھائی۔ فوراً پچھلا گیر لگایا اور دیگن کو واپس لے گئے۔ یہاں تک کہ رستے سے بہت دور پہنچ گئے۔

”بہت خوب جمشید۔ اسے کہتے ہیں ذہانت“

”شکریہ سر۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ ہم اچانک رستے کے پاس رکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور پھر بوکھلاہٹ میں دیگن سے نیچے چھلانگیں لگا دیں گے۔ اور وہ ہمیں اپنی گولیوں کی بوچھاڑ پر دکھ لیں گے، لیکن ہوتا وہی ہے۔ جو اللہ چاہے۔“ انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

”لیکن۔ انکل۔ ہم لوگ شاید بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ پیچھے دیکھیے! آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

ان سب نے ایک ساتھ پیچھے دیکھا۔ اور دھجک سے رہ گئے۔ سڑک پر ایک ٹرک اڑا کر کے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس جگہ سڑک کے دونوں طرف ڈھلوان جگہ تھی۔ اور گہرے کھڈ بھی تھے۔ گویا آگے رستہ تھا۔ پیچھے ٹرک اور درمیان میں وہ۔ سڑک سے دیگن اُتار کر لے جا نہیں سکتے تھے۔

”حیرت ہے۔ یہ ٹرک کہاں سے آگیا۔ ہمارے پیچھے تو تھا نہیں۔“ کمین بڑبڑایا۔

”پیچھے ٹرک لانے کی انھیں ضرورت بھی کیا تھی۔ اس جگہ کے آس پاس کہیں چھپا رکھا ہوگا۔ جب ہم یہاں سے آگے گزر گئے تو یہ اسے سڑک پر لے آئے۔ وہاں ٹرک نیچے اُتارنے کی جگہ ہوگی نا۔“ انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمیں ان سے دو دو ہاتھ کرنا ہی ہوں گے۔ پروفیسر داؤد نے کہا۔

”اورد دوسرا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ نہیں چاہتے۔ ہم وہاں پہنچ سکیں۔ جہاں آپ ہمیں لے جانا چاہتے ہیں! آفتاب بولا۔

”ہاں! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“

ان کے ہاتھوں میں اب پستول نظر آ رہے تھے۔ دفتر سے چلتے وقت وہ اسلحے سے لیس ہو چکے تھے، کیوں کہ آئی جی صاحب نے انھیں یہ احساس تو دلا ہی دیا تھا کہ مهم خطرناک ہو سکتی ہے۔ ابھی تک دشمنوں میں سے کوئی ایک فرد بھی نظر نہیں آیا تھا۔ نظر صرف ٹرک آیا تھا یا رستہ۔

”عجیب دشمن ہے۔ ابھی تک وار نہیں کیا، حالاں کہ ہمیں دو طرف سے چانس چکا ہے۔ آئی جی بڑبڑائے۔  
”پتا نہیں اس کا کیا پروگرام ہے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔  
”کچھ میں عرض کروں۔“ فرحت بولی۔

”ضرور فرحت۔ یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔  
”دشمن چاہتا ہے۔ ہم وگن سے چلا گئیں لگا دیں۔ اور ادھر وہ ہم پر فائرنگ شروع کر دے۔ اس نے کہا۔  
”لیکن وہ وگن پر بھی گولیاں برسا سکتے ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”ہو سکتا ہے۔ انھیں وگن کی ضرورت ہو۔“ کمسن بولا۔  
”اوہ ہاں۔ شاید یہی بات ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں؟“

”ہمارے پاس ان حالات میں بس ایک ہی راستا ہے۔“ فرحت دلی آواز میں بولی۔

”تو بتا دو نا۔“ فاروق نے اسے گھورا۔

”ڈرائیونگ سیٹ انکل آئی جی سنبھال لیں۔ انکل جمشید ریوالور ہاتھ میں لے لیں، پھر گاڑی تیزی سے رستے کی طرف بڑھے، ادھر ہم رستے کے عین نزدیکی پہنچیں۔ ادھر انکل فائر کریں۔ میرا مطلب ہے۔ رستے پر فائر۔“

”دس۔ دس۔ رستے پر فائر۔ جی واہ۔ یہ تو کسی نادل کا نام ہو سکتا ہے۔“ فاروق چمکا۔

”دھت تیرے کی۔ ان حالات میں بھی اسے نادلوں کے نام سمجھ رہے ہیں۔“ آفتاب نے جل کر کہا۔

”محمود کا پارٹ ادا کرنے کا شکریہ۔“ فرحت مسکرائی۔

”فرحت کی ترکیب۔ دل کو بھائی۔ ہم یہی کریں گے۔“

لیکن رستے سے آگے جا کر ہم دوڑ نہیں لگا جائیں گے۔ بلکہ ان سے ٹکرائیں گے۔ ورنہ یہ پھر ہمارے راستے میں رکاوٹ پر رکاوٹ کھڑی کریں گے۔“

”یہ بات عین میری مرضی کے مطابق ہے۔“ آئی جی بولے۔

”تو پھر تیار ہو جائیں۔ ہم ترکیب پر عمل کرنے لگے ہیں۔“

دیگن کا انجن انھوں نے بند نہیں کیا تھا۔ غیر محسوس طور پر انھوں نے آئی جی صاحب سے سیٹ تبدیل کی۔ ریوالور ہاتھ میں لیا اور پھر دیگن ایک دھکے کے ساتھ آگے بڑھی۔ اور پولوی رفتار سے آگے بڑھی۔ ساتھ ہی انھوں نے ٹرک کا انجن بیدار ہونے کی آواز سنی۔

وہ بلا کی رفتار سے رستے سے نزدیک ہوتے جا رہے

تھے۔

## بمبئی

چھ سات سانپ ان کے آس پاس ایک ساتھ گرے اور پھین اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ساکت رہ گئے۔

"یا اللہ رحم۔ ہم اس مرتبہ پیروں سے تو نہیں ٹکرا گئے، شوکی نے کانپ کر کہا۔

"پیروں سے بعد میں بات ہوتی رہے گی۔ پہلے سانپوں سے ملاقات کر لینی چاہیے۔ محمود سکرایا۔

"اب ایک پستول سے فائر کرنا نقصان دہ ہوگا۔ بیک وقت چھ فائر ہونے چاہئیں۔ خان رحمان بولے۔

"میں ٹھیک ہے۔ ان سب نے اپنے اپنے پستول نکال لیے۔

اور پھر ایک ساتھ سات فائر ہوئے۔ اشتقاق اور شوکی کا نشانہ خطا

گیا۔ باقی سانپوں کے سراڑ گئے۔ باقی پنج رہنے والے سانپوں

نے شوکی اور اشتقاق کا رخ کیا:

"ارے باپ رے۔ وہ خوف زدہ ہو کر بے تحاشہ دوڑ پڑے،



انپکٹر کامران مرزا نے ایسے میں بہت پھرتی دکھائی۔ اور دو فائر اور کیے۔ دو سانپوں کے چار بن گئے۔

”ہمارے نامعلوم دشمن۔ اگر شاک میں اور سانپ ہیں تو وہ بھی جیج دو۔ آفت نے چلا کر کہا۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

”نہیں بھئی۔ اس بار کا دشمن بہت عجیب ہے۔ وہ جوش میں آ کر کوئی کام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ہر کام اپنے پروگرام کے مطابق کر رہا ہے۔ ابھی تک ہم نے نہ تو اسے دیکھا ہے۔ نہ اس کے کسی ساتھی کو۔ اور نہ ان میں سے کسی کی آواز ہی سنی ہے۔“

”لیکن کب تک انکل۔ آخر اسے سامنے آنا پڑے گا۔ محمود نے منہ بنایا۔

”کیوں نہ آپ اسے لٹکادیں۔“ فرزانہ بولی۔

”وہ بے وقوف نہیں ہے کہ میری لٹکا دے جوش میں آ کر بات کر بیٹھے گا۔ اس طرح تو ہم اس جگہ کا اندازہ لگا لیں گے جس جگہ وہ چھپا ہوا ہے۔“

”ہوں! تب پھر ہم اپنا پہلا پروگرام جاری رکھیں گے۔ ہم اس میدان سے اس قدر دور ہٹ جائیں گے کہ وہ خود ہی روکنے کی ضرورت محسوس کرے گا۔“ خان رحمان نے بھٹا کر

کہا۔

”تو کیا ہم مخالفت سمت میں دوڑ لگائیں؟ محمود نے پوچھا۔

”نہیں۔ دوڑ لگانے کی صورت میں ہم ان کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ ہم زمین پر ریگ کر اس میدان سے دور ہٹیں گے۔“

انہوں نے ریگنا شروع کر دیا۔ دشمن کے پاس شاید سانپوں کا شاک ختم ہی ہو چکا تھا، کیوں کہ اس کے بعد کوئی سانپ ان کے آس پاس آ کر نہیں گرا۔ وہ دائیں بائیں۔ سامنے اور پیچھے دیکھتے ہوئے آگے کی طرف ریگتے چلے گئے۔ اور پھر ایک فائر ہوا۔ گولی انپکٹر کامران مرزا کے سر سے صرف نصف انچ اوپر سے گزر گئی۔

”زمین سے بالکل چپک جاؤ۔ ہم شدید خطرے میں ہیں۔“ وہ چلائے۔

اب سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ انپکٹر کامران مرزا فائر کی سمت کا اندازہ کر چکے تھے۔ لہذا انہوں نے بھی اللہ کا نام لیا اور اس سمت میں فائر جو تھک مارا۔ خان رحمان نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ پھر تو سب نے ایک ایک فائر کر ڈالا۔ انپکٹر کامران مرزا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ ایک دم بولے:

”خبردار۔ تم میں سے کوئی فائر نہ کرے۔“

”جی کیا مطلب۔۔ کوئی فائر نہ کرے۔ لیکن کیوں؟“

”دشمن کی طرف سے صرف ایک فائر ہوا ہے۔ جب کہ ہم نے سات فائر کیے۔ گویا ایک گولی کے مقابلے میں ہم نے سات گولیاں ضائع کیں۔ جب کہ ہمارے پاس پہلے ہی کم گولیاں ہیں۔ گویا دشمن بھی اس بات سے باخبر ہے۔ یا اسے اس بات کا اندازہ ہے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ ہماری گولیاں ضائع کرا دے۔ تاکہ پھر ہم آسانی سے قابو آ سکیں۔“

”اوہ۔ اوہ۔ ان کے منہ سے نکلا۔“

”لہذا۔ جب تک میری طرف سے ہدایت نہ ملے۔“

کوئی فائر نہ کرے۔ انہوں نے کہا اور پھر آگے کی طرف ریٹنگے لگے۔ ایک اور فائر ہوا۔ اس بار گولی ان کے کندھے کے پکڑوں کو چھوتی گزر گئی۔

وہ ساکت رہ گئے۔ فائر کرنے والا باقاعدہ نشانہ لے

کر فائر کر رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا نشانہ اتنا پختہ نہیں تھا۔ انہوں نے سامنے اور دائیں بائیں بغور دیکھا اور پھر اچانک انہوں نے اسے دیکھ لیا۔ ایک ٹیلے کے عین اوپر جھارٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان جھارٹیوں کے

دوسری طرف انہیں سفید پکڑے کی ایک جھلک سی نظر آئی، گویا اس نے خود کو ان جھارٹیوں کے دوسری طرف چھپایا ہوا تھا۔ انہوں نے ان کی آن میں اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ فوراً ہی ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی ان کے چہروں پر رونق دوڑ گئی۔ یہ پہلی کامیابی حاصل ہوئی تھی انہیں۔

”وہ مارا۔“ آصف بولا۔

”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی نہ جانے کتنے ٹیلوں پر کتنے دشمن موجود ہیں۔“ خان رحمان بڑبڑائے۔ اب انہوں نے پھر ریٹنگا شروع کیا۔ کئی منٹ گزر گئے، لیکن دوسری طرف سے پھر کوئی فائر نہ ہوا؛

”یہ لوگ تھک تو نہیں گئے؟“ شوکی بولا۔

”نہیں کسی گھرے چکر میں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت گزرنے کے بعد چکر ہماری سمجھ میں آئے۔“ فرزانہ بڑبڑائی۔

”تو پھر اپنی عقل کو آواز دو۔ کہیں آج تم اپنی عقل گھر تو نہیں چھوڑ آئیں؟“ محمود نے ہنسا کر کہا۔

”اور کیا تم تو عقل سے ویسے ہی پیدل ہو؟“ فرزانہ نے فوراً جواب دیا۔

”ہم اس وقت موت کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان حالات میں بھی تم باتیں کر رہے ہو۔“ خان رحمان نے انہیں گھورا۔  
 ”اوہ معاف کیجیے گا انکل۔ ہم تو جھول ہی گئے تھے کہ خیر۔ فرزانہ۔ زور دو اپنی عقل پر۔“ محمود نے جلدی جلدی کہا۔  
 ”وہ سوچ میں ڈوب گئے، پھر انپکٹر کا مرزا کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی :  
 ”شاید ہم بہت دیر کر چکے ہیں۔“

”ہاں! آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ ہمیں پیچھے ہٹنے دیکھ کر انہوں نے یہ ترکیب شروع کی تھی کہ ٹیلوں کے پیچھے چھپے لوگوں نے ہمیں غیر محسوس طور پر اپنے گھرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران ہمیں الجھائے رکھنے کے لیے پہلے تو سانپ چھوڑے گئے۔ پھر ایک فائر کیا گیا۔ اور اب ہم شاید ان کے گھرے میں ہیں۔“ خان رحمان کہتے چلے گئے۔

”اوہ! سب کے سب دھک سے رہ گئے۔ اسی وقت ایک آواز گونجی :

”تم لوگ اپنے ہتھیار چھینک دو۔ اور ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔ چاروں طرف سے گھرے جا چکے ہو۔ اگر ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو ہم چاروں طرف سے

گولیاں برسا دیں گے۔ اور تم میں سے ایک بھی نہیں بچ سکے گا۔“

یہ آواز گونجتی چلی گئی۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا :  
 ”کیا۔ وہ سچ کہہ رہا ہے انکل۔“ محمود نے خان رحمان کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال تو یہی ہے۔ وہ بولے۔“

”پھر۔ ان حالات میں آپ کا مشورہ کیا ہے؟ آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

”ہتھیار ڈالنے کا ایک فائدہ ہے۔ ہم ان لوگوں کو نزدیک سے دیکھ سکیں گے۔“ انپکٹر کا مرزا بولا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ خان رحمان نے کہا اور پھر بلند آواز میں بولے :

”ہم اپنے پستول چھینک رہے ہیں اور ہاتھ اوپر اٹھا رہے ہیں۔ آپ لوگ فائر نہ کریں۔“

”پستول اس قدر بلند اور دور اچھا لو کہ ہم انہیں دور گرتے صاف دیکھ سکیں۔“ کہا گیا۔

”اچھی بات ہے۔“ چھینک دو۔ جی پستول۔“ انپکٹر کا مرزا نے کہا۔



پستول فضا میں اُچھلے۔ اور پھر دُور جا کر گرے۔

”بہت خوب۔ فضا میں صرف چھ پستول اُچالے گئے ہیں، جب کہ تم لوگ سات ہو۔ ساتواں پستول کہاں گیا؟ دوسری طرف سے کہا گیا۔“

وہ چونک اٹھے۔ انھوں نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر بولے:

”یہ چلیجے۔ یہ رہا ساتواں پستول بھی۔“

اور انھوں نے اپنا پستول بھی اچال دیا۔ گویا پہلے انھوں نے اپنا پستول نہیں اچالا تھا۔ لیکن دشمن بھی کم عقل نہیں تھا۔ اب انھوں نے ہاتھ سروں سے بلند کر دیے اور آگے بڑھنے لگے۔ اب بھی انھیں کوئی نظر نہیں آیا۔ تھا۔ جب وہ بالکل سرے پر پہنچ گئے تو آواز سنائی دی:

”دائیں طرف مڑ جاؤ۔ اور پیچھے دیکھے بغیر آگے بڑھنا شروع کر دو۔ اگر کسی نے بھی پیچھے دیکھا تو گولی اس کے جسم کے پار ہوگی۔“ یہ الفاظ غرا کر کہے گئے۔

انھوں نے ہدایات پر عمل کیا۔ پانچ منٹ تک چلنے کے بعد وہ ایک ڈھلوان جگہ میں پہنچ گئے۔ اس کے چاروں طرف ٹیلے دیوار کی صورت میں موجود تھے۔

”اب تم مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہو۔ ہم ان ٹیلوں پر موجود ہیں۔ اور تم کوشش بھی کرو تو کسی طرف سے نکل نہیں سکتے۔ لہذا ہمارا ایک مشورہ اور مان لو۔“

”اور وہ کیا؟ انپکٹر کامران مرزا نے پرسکون آواز میں کہا۔“ یہ رسی کا ایک گولا ہے۔ تم لوگوں کے لیے کافی رہے گا، اس سے ایک دوسرے کو باندھ لو۔ آخری آدمی کو، ہم خود باندھیں گے۔ لیکن یاد رکھو۔ ہاتھ پیر بالکل کس کر باندھے جائیں۔ اگر کہیں ڈھیلا پن پایا گیا۔ تو پھر ہم سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“

”آپ سے بُرا تو اس وقت بھی کوئی نہیں ہے۔“ اتفاق نے تلملا کر کہا۔

”خبردار۔ ادھر ادھر کی باتیں نہیں چلیں گی۔ ہم لوگ تمہاری چالوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تم لوگ اس وقت بے بس نظر آ رہے ہو۔“

”ادھواچھا۔ یہ بات ہمیں نہیں معلوم تھی۔“ محمود نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”میں نے کہا نا۔ ادھر ادھر کی باتیں نہیں چلیں گی۔“ انھوں نے ایک دوسرے کو باندھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب بندھ گئے۔ آخر میں صرف انپکٹر

کامران مرزا رہ گئے۔

”آپ کو باندھنے کے لیے ہمارے دو ساتھی آرہے ہیں۔ آپ کے چاروں طرف پستول والے موجود ہیں۔ ذرا بھی حرکت کی گولیاں چلا دی جائیں گی۔“

”اچھا۔ نہیں کروں گا ذرا بھی حرکت۔“ انھوں نے شونخ لہجے میں کہا۔

دو آدمی ان کی طرف بڑھے۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب انھوں نے فرٹی کی وادی میں دو آدمیوں کو دیکھا۔ ورنہ اب تک تو وہ صرف آوازیں ہی سنتے رہے تھے۔

”شکر ہے۔۔۔ دو آدمی نظر تو آئے۔“ محمود بولا۔

”نظر آنے کی بھی ایک ہی کہی۔ ابھی تو ہم سب آپ لوگوں کو نظر آئیں گے۔ فکر نہ کریں۔“ ادھر سے کہا گیا۔

”اچھی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتے۔“ شوکی نے جلدی سے کہا۔

”کیا؟ دوسری طرف سے حیرت زدہ انداز میں کہا گیا۔“

”فکر۔“ اس نے کہا اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر دونوں آدمی ان کے نزدیک آگئے۔ اور انھوں نے خود کو ان کے ذریعے بندھوا لیا۔

”باندھنے کے بعد تم دونوں کا کام ختم نہیں ہو جائے گا۔“ اس طرف سے کہا گیا۔

”تو پھر؟ ان میں سے ایک بولا۔“

”ان کی رسیوں کو اچھی طرح چیک کرنا ہو گا۔ کہیں باندھنے میں کوئی چالاکی تو نہیں کی گئی۔ یہ لوگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی چالاک ہیں۔“

”بہت بہتر۔ آپ فکر نہ کریں۔“

انھیں اچھی طرح جکڑنے کے بعد انھوں نے ایک ایک کی رسیاں چیک کیں۔ جہاں انھیں شک محسوس ہوا۔ وہاں انھوں نے اور رسیاں پیٹ دیں۔ آخر ایک نے کہا:

”یہ اب بالکل ٹھیک بندھے ہوئے ہیں۔ ان کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔“

”بھئی دیکھ لو۔ پوری طرح اطمینان کر لو۔“

”ہم اطمینان کر چکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی چاروں طرف بیس کے قریب آدمی نمودار ہو گئے اور ایک ایک قدم ان کی طرف بڑھنے لگے۔ ان سب کے چہروں پر نقاب تھے۔ جن دو آدمیوں نے انھیں باندھا تھا۔ ان کے چہرے بھی نقاب میں چھپے ہوئے تھے:

اب ان لوگوں کو اٹھا کر برز میں ڈال دو۔ ٹیلے پر سے کھا گیا۔

”برز۔ کیا مطلب؟ ان کے مزے نکلا۔

”برز۔ بجلی کا بہت بڑا چولہا سمجھ لیں۔ تم لوگ پہلے تو اس میں پک کر کباب بن جاؤ گے۔ پھر دھواں بن کر فضا میں اُڑ جاؤ گے۔ چلو اچھا ہے۔ اُڑنے کا لطف تو اٹھا لو گے۔“

”میں سمجھ گیا۔ کس برز کا ذکر کر رہے ہیں۔ جج کے موقع پر میں برز دیکھ چکا ہوں۔ وہاں تو خیر برز قربانی کے جانوروں کے لیے لگائے گئے ہیں۔ پچیس تیس لاکھ آدمی وہاں قربانی کرتے ہیں۔ پچیس تیس لاکھ جانور قربان کیے جاتے ہیں۔ حاجیوں کو ان کا سارا گوشت کھانے کی فرصت کہاں۔ کوئی ایک ٹانگ لے جاتا ہے۔ کوئی کسی اور جگہ کا تھوڑا بہت گوشت۔ باقی وہیں پڑے رہ جاتے ہیں۔ ان تمام جانوروں کو برزوں میں ڈال کر دھواں بنا کر اڑا دیا جاتا ہے۔ تاکہ بیماری نہ پھیلے۔ انیکٹر کا مران مرزا نے انہیں بتایا۔

”اوہ! لیکن۔ یہاں ایسے برز کہاں سے آگئے۔“

”یہاں ہم نے ایک چھوٹا سا برز لگایا ہے۔ ہمارا کوئی

ساتھی اگر فدا کرے تو ہم اس کو برز میں ڈال دیتے ہیں۔ برز کا خیال کر کے ہمارے ساتھی فدا کر کے کوئیں دور بھاگتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی تو فدا کر ہی بیٹھا ہے۔ یہ سوچ کر کہ پکڑا نہیں جائے گا۔ لیکن ہمارے پاس ایسے مجرموں کو پکڑنے میں بہت ماہر ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح پکڑ ہی لیتے ہیں اور پھر اسے برز میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ برز اس فری کے میدان کے بیچوں بیچ لگایا گیا ہے۔ وہیں ہمارا اڈا ہے بھولے بھٹکے لوگ اس طرف نکل آتے ہیں تو ہم انہیں ختم کر کے میدان کے سرے پر پھینک دیتے ہیں۔ اس طرح اب بہت کم لوگوں کو اس طرف آنے کی جرات ہوتی ہے۔ باقی رہ گئی پولیس۔ تو اس کو چمک دینا تو ہمارے پاس کا بائیں ہاتھ کا کیل ہے۔ پولیس تو آج تک اس برز کے قریب تک نہیں پہنچ سکی۔ وہ کہتا چلا گیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ تم لوگ کرتے کیا ہو؟ محمود نے بھنا کر کہا۔

”افسوس! ہم اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ اس

سوال کا جواب آپ ہمارے پاس سے پوچھیے گا۔“

”اور آپ کے پاس کہاں ہیں؟ آصف بولا۔“



”بروز کے آس پاس کہیں ملیں گے۔ ان کا دفتر جہاں وہ ہیں ہے۔“

”ہوں! ایک سوال اور اگر آپ برا نہ مانیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”نہیں مانیں گے۔“ وہ ہنسا۔

”ہم نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ آخر ہمیں کس حُسر کی سزا دی جا رہی ہے۔ پہلے تو آپ کے پاس نے ہمارے ایک ساتھی کی آواز بدل کر ہم تینوں پارٹیوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ جب ہم جمع ہو گئے تو اس نے ہمیں فرٹی کے میدان میں آنے کی دعوت دی۔ یہاں آئے تو سانپوں اور گولیوں سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ آخر کیوں؟ یہاں تک کہ فرزانہ دک گئی۔“

”اس آخر کیوں کا جواب تو پاس ہی دے سکتے ہیں۔“

”چلیے پھر ان سے ہی پوچھ لیں گے۔“

”چلو بھئی۔ اٹھاؤ انہیں اور برز کی طرف لے چلو۔ کیوں کہ پاس کا حکم یہی ہے۔“

انہیں کندھوں پر اٹھا لیا گیا۔ اور اس طرح یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ اب وہ لوگ فرٹی کے میدان میں چل رہے تھے۔ یہ میدان نہ جانے کتنا بڑا تھا۔ اگر چھوٹا

ہوتا تو نہ جانے کب کے وہ برز کے قریب پہنچ چکے ہوتے۔ پندرہ منٹ تک کندھوں پر سفر کرنے کے بعد وہ دک گئے اور انہیں زمین پر پٹخ دیا گیا، ساتھ میں کہا گیا:

”یہ حاضر ہیں پاس؟“

”حاضر ضرور ہیں۔ لیکن تمام نہیں! ایک سرسراتی آواز گونجی۔“

”جی ہاں! یہ تو ہے۔ لیکن اس میں ہمارا کیا قصور پاس۔“ جتنے فرٹی کے میدان تک پہنچے، ہم نے حاضر کر دیے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”ہاں! خیر کوئی بات نہیں۔ پہلے ان سے تو پیچھا چھڑا لیا جائے۔“

”بھئی واہ۔ آپ تو ان پر بہت بڑا احسان کر رہے ہیں، انہیں ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ ایک بولا۔

”ہوں! یہ بھی کیا یاد رکھیں گے۔“ پاس ہنسا۔

”آپ لوگوں نے اب تک یہ نہیں بتایا۔ آپ کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”دشمنی۔ بس یوں سمجھ لیں۔ ایک انجانی سی دشمنی ہے۔“

”اُن جانی دشمنی۔ جتنی واہ۔ کمال ہے۔“ آصفت نے منہ بنایا۔

”کیوں! اس میں کمال کی کیا بات؟“ پاس کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

”کمال کی بات یہ کہ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے؟  
 ”یہ ہمارا وقت ضائع کرنے کے چکر میں ہیں باس۔ اس  
 کا ساتھی بول اٹھا۔

”ہاں! میں بھی یہ بات محسوس کر رہا ہوں۔ جلدی کرو۔  
 پھر جوں ہی وہ انہیں اٹھانے کے لیے آگے بڑھے۔ ان  
 میں سے ایک زور سے اچھلا اور دم سے گرا۔

## بڑی چوری

پھر جوں ہی رستہ دیوالہ کی ریچ میں آیا، انہوں نے فائر  
 کر دیا۔ رستہ عین درمیان سے کٹ گیا اور ان کی وگن آگے  
 نکلتی چلی گئی۔ ساتھ ہی وگن پر گولیاں کی بوچھاڑ شروع ہو  
 گئی۔ لیکن اس کی رفتار انہوں نے اس قدر رکھی تھی کہ گولیاں  
 اس کی دیوار کو توڑ کر اندر مار نہ کر سکیں۔ کچھ دائیں بائیں  
 پھسل گئیں۔ کچھ اوپر اور نیچے سے نکل گئیں۔ البتہ وگن کے  
 تمام شیشے ضرور ٹوٹ گئے، تاہم اس کے ٹائر بال بال بچے۔  
 ”ٹرک ہمارے تعاقب میں آ رہا ہے۔“ فادوق چلایا۔

”پردا نہ کرو۔ اس کو بھی دیکھ لیں گے۔“ یہ کہہ کر انہوں  
 نے اپنا رخ پیچھے کی طرف کر لیا اور ٹرک کے اگلے ٹائر کا  
 نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ٹائر پھٹنے کا دھماکا ہوا۔ ٹرک  
 اُلٹے اُلٹے بھا۔ ڈرائیور کافی ماہر ثابت ہوا۔ لیکن ان کی  
 وگن نکلتی چلی گئی۔ بہت دور جا کر انہوں نے گاڑی کو روک

لیا اور اُن کی طرف مڑتے ہوئے بولے :

"کیا خیال ہے۔ سفر جاری رکھا جائے۔ یا پہلے ان لوگوں سے دو ہاتھ کر لیے جائیں۔"

"اب جب کہ ہم بچ کر بھگ آئے ہیں تو پھر ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ پروفیسر دادو نے گبرا کر کہا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ آئی جی بولے۔"

"لیکن سر۔ اس طرح یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ بنیں گے۔ لہذا ان کا اسی جگہ کیوں دکانٹا نکال دیا جائے۔"

وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ ان لوگوں سے نمٹ ہی لیا جائے، چناں چہ وہ لوگ کو واپس موٹا

گیا۔ اور جب انہیں ٹرک ایک دھبے کی صورت نظر آنے

لگ گیا تو وہ وہ لوگ سے اتر کر پیدل اس طرف چل پڑے،

پھر درختوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھنا پڑا۔ یہاں تک کہ

ٹرک کے بالکل نزدیک آگئے۔ یہاں وہ لوگ جلدی جلدی

ٹائیر تبدیل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اب ٹرک کے

آس پاس کوئی بیس کے قریب آدمی موجود تھے۔ ان میں

سے ایک نے شین گن پکڑ رکھی تھی، جب کہ باقی افراد خالی ہاتھ

آپس میں بات چیت میں مصروف تھے۔ ایسے میں ان میں

سے ایک نے کہا :

"باس ہمدردی خوب خبر لے گا۔ اس کا حکم تھا کہ یہ لوگ

کسی طرح بچ کر نہ جائیں۔"

"لیکن ہم نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ لوگ ہیں

ہی بہت چالاک۔ ایک نے جتنا کر کہا۔"

"مطلب یہ ہوا کہ ہمارے پروگرام کے مطابق کام نہیں

ہوا۔ ایک اور نے کہا۔"

"بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس وقت تک ہمارا جو بھی منصوبہ

تھا۔ سب کا سب بے کار گیا۔"

"ہاں اور ہمیں اس کا حد درجہ افسوس ہے۔ بلکہ نہ جانے

کب تک رہے گا۔"

"ابھی تو تم لوگوں کو اور بھی افسوس ہوگا۔ پتہ نہ ہو۔ سب ہاتھ

ادھر اٹھا دو۔ انپیکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔"

وہ بوکھلا کر پلٹے، لیکن پھر پستول تھیں دیکھ کر مشینی

انداز میں ان کے ہاتھ اوپر اٹھتے چلے گئے۔ شین گن والے

نے ان کا نشانہ لینے کی کوشش کی، لیکن انپیکٹر جمشید کے ایک

بھی فائر نے اسے ناکارہ کر دیا۔"

"اب کیا خیال ہے۔ انپیکٹر جمشید مسکرائے۔"

"اُن میں سے کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا :

"تم لوگ کون ہو۔ کس کے لیے کام کر رہے ہو؟"



اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔

"یہ تو گونگے اور بہرے بن گئے ہیں۔ اب ان کا کیا کیا جائے سر؟ انیکٹر جمشید نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔  
"ان سب کو بیٹوں ڈالنا تو اچھا نہیں لگتا۔ ان میں کچھ مجبوری کی حالت میں بھی اس گروہ میں شریک ہونے ہوں گے۔ آئی جی بولے۔

"لیکن سر۔ مجبوری کی حالت میں گروہ میں شامل ہونے والوں کو اب کیا مجبوری ہے۔ اب تو انہیں فوراً بول اٹھنا چاہیے۔ فاروق نے منہ بنایا۔  
"ہو سکتا ہے۔ کسی کے خوف نے ان کے منہ بند کر دیے ہوں۔ وہ مسکرائے۔

"تب پھر کیا کیا جائے۔ انیکٹر جمشید بولے۔  
"ترکیب بتانا فرحت کا کام ہے؟

"ان میں سے ایک کو الگ لے جا کر اس سے سوالات کیے جائیں۔ اگر جواب نہ دے تو گولی مار دی جائے۔ پھر اسی طرح دوسرے کی باری آئے، پھر تیسرے کی۔  
"ترکیب منظور ہے۔ اے تم میرے ساتھ آؤ۔ انیکٹر جمشید نے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔

وہ لرزتا کانپتا ان کی طرف بڑھا۔ پستول اس کی طرف

تھانے وہ اسے بہت دُور لے گئے۔ یہاں تک کہ ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر انہوں نے پوچھا:  
"ہاں! اب بتاؤ۔ ہمارا راستا کیوں روکا گیا تھا؟  
"باس کا حکم۔  
"باس کا نام بتا دو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ باس کو ہم نہیں جانتے۔ وہ جب بھی ہمارے سامنے آیا۔ نقاب میں آیا۔ اس نے لرزتی آواز منہ سے نکالی۔

"میں اس بات پر یقین کر لیتا ہوں۔ ہم پر قابو پانے کے بعد تم لوگوں کا کیا پروگرام تھا؟  
"آپ لوگوں کو ختم کر کے ایک گھرا گھرا کھودا جانا اور اس میں آپ کو دفن کر دیا جانا۔

"ارے باپ رے یہ تو کافی خوفناک پروگرام تھا۔  
"جی ہاں! باس چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔

"لیکن بھئی۔ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"یہ میں نہیں جانتا جناب۔  
"اچھا چلو۔ یہ بتا دو۔ تم اس گروہ میں اپنی خوشی سے

شامل ہوتے ہو یا کسی مجبوری کے تحت؟

”پہلے میں ایک چور تھا۔ ایک بار سزا کاٹ کر نکلا تو ایک نامعلوم آدمی کی طرف سے خفیہ پیش کش ہوئی کہ ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ، پولیس تمہیں اتنے بھی نہیں لگا سکے گی۔ اور مال بھی خوب کماؤ گے۔ بس میری عقل ماری گئی اور میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔“

”ہوں! ٹھیک ہے۔ اگر اب میں تمہیں چھوڑ دوں تو تم کیا کرو گے؟“

”سیدھا اپنے گھر جاؤں گا اور محنت مزدوری کر کے زندگی کے دن گزار دوں گا۔“

”دیکھو بھئی۔ جھوٹ نہ بولنا۔ ورنہ کبھی نہ کبھی تم میرے سامنے ضرور آؤ گے۔ اور اگر میں نے دیکھ لیا کہ تم پھر بھی مجرمانہ زندگی گزار رہے ہو۔ تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“

”یہ۔ یہ تو آپ مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہے ہیں۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔“

”خیر تم جا سکتے ہو۔ لیکن جانے سے پہلے اتنا بتا دو۔ کہ ان میں سے کوئی باس کے بارے میں جانتا ہے یا نہیں؟“

”ہمارا انچارج اس کے احکامات ہم تک پہنچاتا ہے۔ وہ

احکامات کس طرح وصول کرتا ہے۔ ہم نہیں جانتے۔“

”شکریہ۔ انچارج کون ہے؟“

”سُرخ پکڑوں والا۔“

”اپنا پتا لکھوا دو۔ وہ بولے۔“

”جی۔ کیا مطلب۔ پتے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”میں بعد میں چیک بھی تو کروں گا۔ تم سیدھے راستے

پر آگئے ہو یا نہیں۔“

”اوہ اچھا۔ اس نے کہا اور اپنا پتا لکھوا دیا۔ انہوں نے

اپنی نوٹ بک میں پتا لکھا اور اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

سمت بھی بتائی کہ اس طرف سے نکل جاؤ۔ اب وہ پھر باقی

لوگوں کی طرف آئے اور سُرخ پکڑوں والے کی طرف اشارہ

کر کے بولے:

”اے مسٹر۔ آپ آئیں۔“

اس کے چہرے پر حیرت کے بادل نظر آئے، پھر وہ

غاموشی سے قدم اٹھانے لگا۔ انپکٹر جمشید اس کو بھی دہیں

لے آئے:

”باس کا نام کیا ہے دوست؟“

”میں نہیں جانتا۔ اس نے جھٹکا کر کہا۔“

”کیا تم ان لوگوں کے انچارج نہیں ہو؟ وہ بولے۔“

"یہ بات اس غدار نے بتائی ہوگی۔ وہ تھکلا کر بولا۔

"میرے سوال کا جواب دو۔ انیکٹر جمشید خرائے۔

"ہاں! میں ان کا انچارج ہوں۔ پھر وہ بے خوف ہو کر بولا۔

"اور باس سے احکامات تم حاصل کرتے ہو؟ انھوں نے فورا کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے؟

"تب پھر۔ یہ بھی بتا دو۔ تمہیں احکامات ملتے کس طرح ہیں، صاف ظاہر ہے۔ تم براہ راست حاصل کرتے ہو؟

"نہیں۔ وہ فون پر ہدایات دیتا ہے۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کچھ نہیں بتا سکتے۔ اگر بات یہی ہے۔ تو پھر تم بھی وہیں جاؤ۔ جہاں تمہارا ساتھی جا چکا ہے۔ انھوں نے سرد آواز میں کہا۔

"لگ۔ کیا مطلب۔ کیا۔ کیا آپ نے اسے۔"

"تم اپنی فکر کرو۔ وہ خرائے۔ پھر ان کا پستول والا ہاتھ سیدھا ہو گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کے بدن میں تھری دوڑ گئی۔ اور پھر اس نے چلا کر کہا:

"ٹھہریے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے اس کو آج

تک نہیں دیکھا، تاہم میں یہ بتا سکتا ہوں کہ عام طور پر وہ مجھ سے ملاقات کہاں کرتا ہے۔ ہوتا ہے وہ اس وقت بھی نقاب میں۔"

"چلو اتنا ہی بتا دو۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"وہ۔ وہ۔ وہ۔ وہ ہکلا کر رہ گیا۔ ساتھ میں اس نے چاروں

طرف خوف زدہ نظریں دوڑائیں۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا باس یہاں دور دور تک نہیں ہے۔"

"آپ نہیں جانتے۔ وہ تو ایسی جگہوں پر پہنچ جاتا ہے۔

جہاں اس کے پہنچنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

"تو پھر تم پہلے اپنا اطمینان کر لو۔ خوب ادھر ادھر دیکھ لو۔

جب تمہارا اطمینان ہو جائے تو پھر مجھے بتا دینا۔"

"شش۔ شکریہ۔" اس نے گہرا کر کہا اور ایک بار پھر چاروں

طرف دیکھنے لگا۔ کئی سیکنڈ گزرنے کے بعد اس نے کہا:

"حیرت ہے۔ باس یہاں موجود نہیں ہے۔ مالوں کو

اس نے کڑ رکھا ہے۔ کہ جب بھی میں نے اس کے بارے

میں کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی، وہ وہاں موجود ہو گا۔"

"وہ کوئی ہوتا نہیں ہے۔ جتنی محنت نہیں ہے۔ کوئی بادوگر

نہیں ہے۔ ایک انسان ہے۔ اس نے تمہیں چکر دیا ہے۔"



اس کے تو فرشتے بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ انپیکٹر جشید بولے۔  
 ”ہوں۔ شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ خیر۔ ابھی تجربہ ہو جائے گا۔ ہاں تو وہ مجھے ہمیشہ ہوٹل گل رنگ کے کمرہ نمبر ۲۰۱ میں ملتا رہا ہے۔ جلد مکمل کرنے کے بعد اس نے پھر خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ ادھر انپیکٹر جشید حیرت زدہ رہ گئے۔  
 ”کیا مطلب۔ ہوٹل گل رنگ۔ کمرہ نمبر ۲۰۱۔ یعنی رشی خان۔“  
 ”رشی خان۔ میں نہیں جانتا۔ اس کا نام رشی خان ہے یا کیا ہے۔“

”اوہ۔ اچھا خیر۔ آؤ میرے ساتھ۔“

وہ اسے واپس سب کے پاس لائے، پھر انھیں باندھ دیا گیا، لیکن چونکہ ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس لیے دائر لیس کے ذریعے اکرام کو ان کے بارے میں ہدایات دیں۔ اور شوکی کے شہر کے ہوٹل گل رنگ کی نگرانی کی ہدایات بھی دیں۔ خاص طور پر کمرہ نمبر ۲۰۱ کی نگرانی کی۔

انچارج سے ہونے والی گفت گو جب انھوں نے ان کے سامنے دہرائی تو وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لیکن ان کے پاس حیران ہونے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ اب وہ پھر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

”کافی وقت ضائع کر دیا انھوں نے۔ آئی جی بولے۔“

”جی ہاں! یہ تو ہے، لیکن کچھ فائدہ بھی ہو گیا۔ اب ہم رشی خان کو زیادہ اہمیت دیں گے۔“

”اب یہ بات اور بھی صاف ہو گئی کہ وہ ہمیں دارالحکومت سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ پھر وہی سوال ذہنوں میں گونجنے لگا ہے۔ آخر کیوں۔ وہ یہ کیوں چاہتا ہے۔“

”خیر دیکھیں گے اسے بھی۔ پہلے تو یہ دیکھ لیں۔ شیخ صاحب ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔“

اور پھر وہ پہاڑوں کے درمیان پہنچ گئے۔ یہاں ہر طرف فوج اور پولیس نظر آ رہی تھی۔ اور کافی ہل چل سی جی ہوئی تھی۔ پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی ایک عجیب عمارت ان کے سامنے تھی۔ ٹیٹے کی بہت بڑی گول عمارت۔ گلاس نما عمارت۔

”یہ۔ یہ تو گیس پلانٹ پر لے آتے آپ ہمیں۔“

”ہاں! یہ وہ مقام ہے۔ جہاں سے سارے ملک کو گیس فراہم کی جاتی ہے۔ آج گیس پورے ملک کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے۔ قدرت نے ہمیں یہ بیش بہا نعمت عطا کی ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق۔ گیس کے یہ ذخائر ہمارے پورے ملک کے لیے۔ آئندہ تین سو سال تک

کافی ہوں گے۔ لیکن۔ اب ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا۔ انھوں نے پریشان آواز میں کہا۔

”جی کیا مطلب؟ ان سب کے مزے ایک ساتھ نکلا۔  
 ”اؤ میرے ساتھ۔ وہ بولے اور ایک سمت میں آگے بڑھے۔  
 ایک جگہ ایک فوجی آفیسر فوجیوں کو ہدایات دیتا نظر آیا۔  
 وہ ان کی ڈیوٹیاں لگا رہا تھا۔ آئی جی صاحب اس کے پاس سے بھی گزرتے چلے گئے۔ میلوں میں پھیلے ہوئے اس سلسلے کے باقاعدہ دفاتر موجود تھے۔ یہاں ملازم تین شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ رات کے وقت بھی دن کا سماں رہتا تھا۔ گیس کے ان ذخائر سے نہ صرف گھروں میں ایندھن کی بہت بچت ہو گئی تھی۔ بلکہ ملک بھر کے کارخانوں میں گیس کا استعمال ہو رہا تھا۔ اور حکومت کو کروڑوں روپے روزانہ کی آمدنی ہونے لگی تھی۔ گویا گیس کے ذخائر نے ملک کو خوش حالی کے راستے پر ڈال دیا تھا، لیکن اس وقت یہاں فوج اور پولیس کی موجودگی انھیں الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔

انھیں دس منٹ تک چلنا پڑا۔ پھر وہ ایک بڑے اور شاندار قسم کے دفتر میں داخل ہوئے۔ دوواڑے پر کھڑے نگرانوں نے انھیں سلام کیا۔ اور ان میں سے ایک نے ان کو ایک ہال کمرے کا راستا دکھایا۔ ہال میں ایک گول میز کے گرد چند

فوجی آفیسر خاموش بیٹھے تھے۔ انھیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر ان کے چہروں پر قدرے رونق آ گئی:

”اللہ کا شکر ہے۔ آپ آ گئے؟

”یہ لوگ دراصل شہر میں موجود نہیں تھے۔ اس لیے کچھ دیر لگ گئی۔“ آئی جی صاحب بولے۔

”میں خیر۔ مل تو گئے۔ یہی بڑی بات ہے۔ اب ہم مزید وقت ضائع کیے بغیر بات کرتے ہیں۔ انپیکٹر جمشید۔ آپ کو یہ سن کر ضرور حیرت ہوگی کہ گیس کے ان ذخائر میں پوری ہو رہی ہے۔ ایک بہت بڑی چوری۔“

”جی! کیا مطلب؟“  
 وہ اچھل پڑے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا، کسی طرح ریاں  
ٹوٹ جائیں۔ اور وہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔ لیکن ابھی تک وہ  
اپنے ہاتھ اور پیر آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے،  
”افسوس! ہم کیا کریں؟“ محمود بڑبڑایا۔  
”صبر! شوکی نے کہا۔

”اُسی وقت انپکٹر کامران مرزا نے دو دشمنوں کو آپس میں  
ٹکرا جانے پر مجبور کر دیا۔ ان دونوں نے مخالف سمت سے  
ان پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ تیر کی طرح درمیان سے بیکل  
گئے اور وہ بُری طرح ٹکرا گئے۔ ٹکرا کر مخالف سمتوں میں  
گرے۔“  
”واہ۔ کیا پھرتی ہے؟“ خان رحمان چمکے۔

”انکل۔ کیا آپ اس وقت تیج و تاب نہیں کھا رہے؟  
فرزاد کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بھوک نہیں ہے بھتی۔ میں لڑائی دیکھنے میں مصروف  
ہوں۔“ انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

”اُسی وقت ایک دشمن انپکٹر کامران مرزا کی کمر سے  
پورے زور سے ٹکرایا۔ وہ اوندھے منہ گرے۔ بس پھر کیا تھا،  
ان سب نے ایک ساتھ ان پر چھلانگیں لگا دیں۔ کئی تو ان  
کے اوپر بھی آ کر گرے اور کئی راستے میں ہی ایک دوسرے

## گولی کی زبان

”اُچھلنے والے کے پیٹ میں دو لائیں بہت زبردست انداز  
میں لگی تھیں اور یہ دو لائیں انپکٹر کامران مرزا کے علاوہ کسی  
کی نہیں ہو سکتی تھیں۔ دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ اب تک جو  
ہاتھ کمر کے پیچھے تھے۔ وہ بھی سامنے آ گئے۔ گویا وہ رسیوں  
سے پوری طرح آزاد ہو چکے تھے۔ ادھر دشمن اپنے ساتھی کے  
اس طرح اُچھلنے پر مدد دے ہو کھلا گئے تھے۔ انھوں نے ان  
کی ہو کھلا ہٹ سے فائدہ اُٹھایا اور ان پر بجلی کی طرح برس  
پڑے۔ ان کے ہاتھ اور پیر اس قدر تیزی سے چلے کہ ان  
پر نظر نہ پڑ سکی۔ دشمن الٹ الٹ گیا۔ لیکن پھر وہ سب  
مل کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ یعنی وہ بھی منبھل گئے۔ یہ دیکھ  
کر باس کی جان میں جان آئی۔ اس نے چمک کر کہا:  
”بہت خوب۔“ پیس ڈالو اسے۔“

محمود، آصف، فرزاد اور خان رحمان کا بُرا حال تھا۔



سے ٹکرا گئے، تاہم ٹکرائے کے بعد ضرور ان پر گرے۔  
اور اس طرح وہ چودہ پندرہ آدمیوں کے نیچے دب کر رہ گئے۔  
پانچ چھ کو وہ اس وقت تک بے کار کر چکے تھے۔  
”بس شاباش۔ اب اسے اٹھنے نہ دینا۔“

محمود وغیرہ کا حال برا ہو گیا۔ انھوں نے رسیوں پر پورا  
زور صرف کر دیا۔ ادھر انپکٹر کامران مرزا اٹھنے کے لیے پورا  
لگا رہے تھے، لیکن پندرہ آدمیوں کو اچھال پیسٹنا آسان تو  
نہیں تھا۔ انھیں دانتوں پیسنے آ گیا۔ ان کے ہاتھ اور پیئر  
جواب دے گئے۔ سر بُری طرح زمین سے دگڑ کھا رہا تھا۔  
گٹھنے تھے کہ چھلے جا رہے تھے۔ پھر ان کی آنکھوں کے آگے  
اندھیرا آ گیا۔ حواس جواب دیتے محسوس ہوئے۔ ایسے میں  
انھوں نے اللہ کو یاد کیا اور عقل پر زور دیا۔ اچانک انھیں ایک  
بات سوچی۔ اب تک وہ پندرہ کے پندرہ آدمیوں کو اچھال  
پیسٹنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ لیکن اب انھوں نے صرف  
اپنی گردن پر گرے ہوئے پر زور لگانے کا فیصلہ کیا۔  
اس کی ایک کلائی ان کے دائیں ہاتھ سے صرف ایک انچ  
دور تھی۔ لیکن وہ کچھ اس طرح جکڑے گئے تھے کہ ایک  
انچ کا فاصلہ طے کرنا بھی بہت جان جوکھوں کا کام محسوس  
ہوا، تاہم یہ ایک انچ انھوں نے کسی نہ کسی طرح طے

کر ہی لیا۔ اب ان کا ہاتھ اس کی کلائی پر جم گیا۔ زور  
جو لگایا تو کلائی مڑی اور اس انداز سے مڑی کہ دشمن کے منہ  
سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ وہ چلا یا:  
”م۔ میں۔ میں مرا۔ میرا ہاتھ گیا۔ ہٹ جاؤ۔ میرے اوپر  
سے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو میں گیا۔ کام سے۔“  
”یہ۔ یہ آواز انپکٹر کامران مرزا کی تو نہیں ہے۔“ باس کی  
حیرت زدہ آواز ابھری۔

”نہیں باس۔ یہ ہمارے ساتھی شیفے کی آواز ہے۔“

”اس کو کیا ہوا؟“

”پتا نہیں باس۔ ایک نے گہرا کر کہا۔“

”ارے ارے۔ یہ کیا۔ شیفے نے مجھے دانتوں سے کاٹ

کھایا ہے۔ آٹ میں مرا۔ ایک چلا کر بولا۔“

اور پھر ان میں ہل چل مچ گئی۔ انپکٹر کامران مرزا اب  
اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہو گئے تھے کہ اس ہل چل کے  
عالم میں بھی ان کے نیچے سے نہ نکل سکتے۔ لہذا زور جو لگایا  
تو انھیں آٹ دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ شیفے کی کلائی اب بھی  
ان کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ غصہ بھی آ گیا تھا۔ لہذا اس  
کی کلائی کو پکڑ کر گھما دیا۔ اس نے ایک چکر کھایا اور جو  
جو اس کی لپیٹ میں آیا، گرتا چلا گیا۔ شیفے کے منہ سے

بلند چہنیں آزاد ہو رہی تھیں۔ ایسے میں محمود اور آصف وغیرہ کی نظریں باس کی طرف اٹھ گئیں۔ دہاں اب بوکھلاہٹ کا راج تھا۔ انپکٹر کامران مرزا نے ایک منٹ کے اندر اٹھ نو آدمی اور بے کار کر دیے۔ گویا اب ان کے مقابلے میں صرف پانچ آدمی رہ گئے تھے۔ ادھر ان پر غضب کا جوش طاری ہو چکا تھا۔ یہ پانچ اس جوش کے آگے کب تک ٹکے۔ انہیں گرانے کے بعد انپکٹر کامران مرزا باس کی طرف بڑھے۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے مسٹر باس؟“

”میں تو گولی کی زبان میں بات کرتا ہوں۔“ باس کی چمکتی آواز سنائی دی۔ اور اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا پستول نظر آیا۔

”ابھی بات ہے۔ تمہارے دل میں حسرت نہ رہ جائے۔“

پستول کی زبان میں ہی باتیں کر لیتے ہیں۔ وہ چمک کر بولے۔

باس نے غصے میں آکر ان کی طرف ایک فائر جھونک مارا،

وہ تڑپ سے گرے۔ گولی ان کے اوپر سے گزر گئی۔

”تمہاری ایک گولی کی زبان تو خاموش ہو گئی۔ وہ بولے۔“

”دوسری لوٹ۔ اس نے کہا اور پھر فائر کر دیا۔“

اس بار انپکٹر کامران مرزا نے لوٹ لگائی تھی۔

”تیسری کوشش کرو۔ وہ بولے۔“

باس نے اس مرتبہ غصے میں آکر ایک فائر نہیں کیا۔ تین فائر اوپر تلے کیے۔ انپکٹر کامران مرزا گویا بجلی کی طرح تڑپتے چلے گئے۔ فائروں کی آواز دے سکتے ہی انہوں نے کہا:

”پانچ گولیاں ضائع ہو گئیں۔ باقی رہ گئیں تین۔“

باس غصے میں اندھا ہو گیا۔ ایسے میں نشانہ کیا لیتا۔

لہذا باقی گولیاں بھی ادھر ادھر سے نکل گئیں۔ جوں ہی

اس نے آٹھواں فائر کیا۔ انپکٹر کامران مرزا نے اس پر

چھلانگ لگا دی۔ دونوں دھڑام سے گرے۔ اب انپکٹر

کامران مرزا اس کے اوپر تھے۔ اور ان کے ہاتھ اس کی

گردن پر جمے تھے۔ جب کہ وہ نیچے سے نکلنے کے لیے پورا

زور لگا رہا تھا۔ اس وقت انہوں نے محسوس کیا۔ ان کا حریف

کمزور نہیں تھا۔ غصے میں آکر جلد بازی ضرور کر بیٹھا تھا،

انہوں نے اسے موقع دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کا ایک

ہاتھ اچانک ان کی گردن پر سے ہٹ گیا، پھر آن کی

آن میں ہاتھ بلند ہوا اور اس کی ٹہنی اس کی کن پٹی پر

پوری طاقت سے لگی۔ اس کے منہ سے ایک دل دوزخ

رنگی اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔

اب انھوں نے جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کو کھولا :  
 "حیرت ہے انکل۔ آپ کے ہاتھ تو باس کے آدمیوں نے  
 باندھے تھے۔ ان کو تو آپ نے چھڑا لیا۔ اور آپ کے باندھے  
 ہوئے ہاتھوں کو ہم آزاد نہ کرا سکے۔"  
 "میں نے جان بوجھ کر تمہارے ہاتھ پیر سختی سے باندھے  
 تھے۔ وہ مسکرائے۔

"جی۔ وہ کیوں؟"

"تاہم رسیوں کی مضبوطی کو چیک کرنے والوں کا پوری طرح  
 اطمینان ہو جاتے۔ انھیں ذرا بھی شک نہ ہو کہ ہم کوئی  
 چال چلنے کے موڈ میں ہیں۔ لہذا انھوں نے میرے ہاتھ  
 باندھنے میں احتیاط نہیں کی۔ اور میں اپنا کام دکھا گیا۔  
 میں نے دونوں ہاتھوں کو اس رخ سے رکھا کہ جب میں  
 رسیوں سے باندھ دیے جانے کے بعد ان کا رخ بدلوں  
 تو رسیوں میں ڈھیلا پن پیدا ہو جائے اور یہی ہوا۔ انھوں  
 نے جلدی جلدی کہا۔

ان کے ہاتھ کھلتے چلے گئے اور اس کے ساتھیوں کے  
 ہاتھ پیر بندھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب  
 بندھے نظر آئے۔ ان میں سے کئی شدید زخمی بھی تھے، لیکن  
 اس وقت ان کے پاس مرہم پٹی کا سامان نہیں تھا۔ ورنہ وہ

ان کی مرہم پٹی ضرور کرتے۔ اگرچہ وہ ان کے دشمن تھے۔  
 "اور اب ہم۔ باس کا چہرہ دیکھنے کے لیے بڑی طرح  
 بے چین ہیں۔ خان رحمان بولے۔

"صاف ظاہر ہے۔ یہ رشی خان ہے۔" اشفاق نے کہا۔  
 "اور بچوں کہ رشی خان کو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔  
 اس لیے ہم آچھل وچھل تو سکیں گے نہیں۔" محمود بولا۔  
 "چلو خیر۔ نہیں آچھلیں گے۔ دیکھ تو لیں گے کہ مٹر رشی  
 خان کس شکل صورت کے آدمی ہیں۔"

"میری طرف سے اجازت ہے۔ اس کا نقاب الٹ دو۔"  
 انپیکٹر کامران مرزا بولے۔

آصت آگے بڑھا۔ اور باس کے چہرے سے نقاب اتار  
 دیا۔ دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ ان کے سامنے تو ایک جانا  
 پہچانا آدمی کھڑا تھا۔

"ہائیں۔ ہمارا اندازہ تو غلط ہو گیا۔ دھت تیرے کی۔"  
 محمود کے منہ سے نکلا۔

"یہ ضروری نہیں۔" انپیکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"جی۔ کیا مطلب۔ کیا ضروری نہیں۔"

"یہ کہ۔ ہمارا اندازہ غلط ہو۔ وہ بولے۔

"آپ۔ آپ۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"



"ہمارے سامنے اس وقت باس کی صورت میں ہوٹل گل رنگ کا مالک فرطوس موجود ہے، لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ رشی خان بھی یہی ہو؟"

"نہیں مسٹر انپکٹر کامران مرزا۔ تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میں رشی خان ہرگز نہیں ہوں۔ میں صرف فرطوس ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میں رشی خان کا ایک ادنیٰ کارکن ہوں۔ وہ تو بہت بڑی چیز ہے۔ اتنی بڑی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔" "اں! کم از کم ہاتھی جتنی بڑی چیز تو ضرور ہو گا وہ۔"

شوکی نے منہ بنایا۔

"اس سے بھی بڑی چیز۔ ہاتھی تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔" فرطوس نے منہ بنا کر کہا۔

"یار آصف۔ بھلا ہاتھی سے بڑی چیز کیا ہوتی ہے؟"

محمود نے گہرا کر کہا۔

"ہاتھی۔ اس نے فوراً کہا۔

"کیا مطلب؟ محمود چونکا۔

"بھئی ایک ہاتھی سے بڑی چیز اس سے بڑا ہاتھی ہی ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا۔

"میرا مذاق اڑاؤ، لیکن جب رشی خان تم لوگوں کے سامنے آئیں گے تو معلوم ہو گا، آٹے دال کا بھاؤ۔"

"ہائیں۔ تو کیا وہ آٹا دال بیچتے ہیں؟ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بہت چمک رہے ہو۔ ہم پر قابو پا لیا نا۔ اس نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں مسٹر فرطوس۔ ہم تو اس وقت بھی چمک رہے تھے، جب بندھے ہوئے تھے۔" آصف بولا۔

"بھئی یہ باتیں ہم واپسی کے سفر میں کر لیں گے۔ اس وقت تو چلنا چاہیے۔ یا تو یہ حضرت جھوٹ بول رہے ہیں۔

اور خود رشی خان ہیں۔ یا پھر رشی خان واقعی کوئی اور ہے۔

بہر حال اس نے ہمیں لٹکا رہا تھا کہ فرٹی کے میدان میں آؤ۔ ہم آگئے۔ وہ خود نہیں آیا۔ اپنے کارندوں کو بھیج دیا۔ اب جب وہ پھر نہیں پکارے گا۔ ہم پھر اس تک پہنچنے کی کوشش کر ڈالیں گے۔ آؤ اب چلیں۔"

وہ دہان سے واپس ہوئے۔ ان لوگوں کو حکم سرخ رسانی کے حوالے کیا، ہوٹل گل رنگ کی نگرانی کی ہدایات دیں تو انھیں بتایا گیا کہ اس ہوٹل کی نگرانی کی ہدایات پہلے ہی مل چکی ہیں۔ اور یہ ہدایات انپکٹر جمشید کی طرف سے ملی ہیں۔

یہ سن کر وہ چونک اٹھے۔

"تب تو ہمیں فوراً ان کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ انپکٹر

تب تو ہمیں فوراً ان کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ انپکٹر

کامران مرزا بولے۔

وہ اُسی وقت وہاں سے دارالحکومت کے لیے روانہ ہوئے اور پھر وہاں سے انھیں ایک سرکاری گاڑی میں گیس کے ذخائر تک پہنچایا گیا۔ جب وہ ہال میں داخل ہوئے، اُسی وقت انھوں نے انپکٹر جمشید کی حیرت زدہ آواز سنی :

”کیا مطلب؟“



”اس کیا مطلب میں کیا ہم بھی شریک ہو سکتے ہیں ابا جان۔“ محمود نے شوخ آواز میں کہا۔

”ارے۔ اودہ۔“ اُمیں۔ ان کے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں ! ہم واقعی آپکے ہیں۔ آپ بے شک یقین کر لیں۔“

فرزانہ بولی۔

”آئیے بھئی۔ آئیے۔ اچھا ہوا۔ ہم پھر ایک جگہ جمع ہو گئے، یہاں ضرورت بھی زیادہ آدمیوں کی ہے۔“

”باہر ہم ہل چل دیکھ آئے ہیں۔ آخر یہ سب کس سلسلے میں ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہمارے گیس کے ذخائر میں چوری ہو رہی ہے۔“

”کیا کہا۔ گیس کی چوری۔“ آصف کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اودہ۔ یہ۔ یہ تو۔“ فاروق دھک سے رہ گیا۔

”ہاں ہاں ! ہم جانتے ہیں۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔“ آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

”میرا خیال ہے۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر اس چوری کی تفصیل سن لیں۔ تاکہ پھر اس کا سراغ لگانے کے لیے نکل سکیں۔“

انپکٹر جمشید نے جلدی سے کہا۔

”یہ سر۔ آپ نے بجا فرمایا۔“

اب وہ سب بیٹھ گئے۔ ایسے میں مکھن کے منہ سے نکلا :

”لیکن انکل۔ فرنی کے میدان میں کیا رہا؟“

”اودہ ہاں ! یہ جاننے کے لیے تو ہم بُری طرح بے چین ہیں، اور اس چوری کی تفصیلات معلوم کرنے میں تو شاید دیر لگ جائے گی۔ لہذا کیوں نہ پہلے ان کی طرف کی کہانی سن لیں۔“

فرحت نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

”ہوں ٹھیک ہے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

اور انپکٹر کامران مرزا نے پوری تفصیل سنا دی۔ وہ حیرت زدہ انداز میں سنتے رہے۔ پھر انپکٹر جمشید نے اپنے سفر کی روداد انھیں سنائی تو وہ بھی حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایسے میں محمود بولا :

”گویا۔ اس وقت تک رشی خان اور فرطوس یہ دو نام ہمارے سامنے آئے ہیں۔“

”ہاں! فرطوس کو ہم گرفتار کر چکے ہیں۔ جب کہ رشی خان سے ابھی واسطہ نہیں پڑا۔ اور چوں کہ انھوں نے اس سفر میں ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا اس کا مطلب ہے رشی خان اسی سلسلے میں ہمیں دارالحکومت سے دور کہیں ابھانا چاہتا تھا۔ گویا اسے یہ خوف ہے کہ ہم اس چوری کا سراغ لگا لیں گے۔“

”اوہ۔ اوہ۔“

”اُن سب کے مُنڈ سے نکلا۔ عین اُسی وقت ایک فوجی اندر داخل ہوا۔“

## پائپ لائن

کمرے میں موجود فوجیوں نے سوالیہ نظروں سے اس فوجی کی طرف دیکھا جو ہال میں داخل ہوا تھا:

”ہاں جی۔ کیا بات ہے؟ ایک آفیسر نے کہا۔“

”کرنل صاحب تشریف لے آئے ہیں۔“

”اوہ۔ اچھا! ان کے منڈ سے نکلا، پھر وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔“

”کرنل صاحب۔ کیا مطلب؟ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔“

”ہماری حکومت کا خیال ہے۔ یہ کیس فوجی نوعیت کا ہے۔ اس لیے اس کی تمام تر تفتیش فوج کی نگرانی میں کی جائے گی۔ اور پھر گیس کی سپلائی لائنوں کو چیک بھی فوجی ہی کر سکتے ہیں۔“ آئی جی صاحب نے بتایا۔

”وہ کیوں؟ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔“

”یہ لائنیں فوجیوں نے ہی بچھائی تھیں۔ لہذا ان کو چیک



بھی یہی کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کرنل صاحب نے  
یہ سارا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔

”ہوں! انھوں نے اچھا ہی کیا۔“  
اتنے میں بھاری قدموں کی آواز گونجی اور ایک درمیانے  
قد کے فوجی آفیسر اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے ایک نظر  
ان سب پر ڈالی۔ اور پھر سر کو قدرے جھکا کر بولے :  
”کرنل راضی سب کی خدمت میں السلام علیکم عرض کرتا

ہے۔“  
”وعلیکم السلام۔“ سب کی آوازیں گونجیں۔

پھر کرنل راضی اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے اور بولے :  
”کیا ہم کام شروع کریں۔ ارے یہ کون لوگ ہیں؟ ان کی  
نظریں ان سب پر جم گئیں۔ اس وقت وہاں یا تو وہ لوگ  
غیر فوجی لباس میں وہاں موجود تھے۔ یا آئی جی صاحب۔  
ورنہ سبھی فوجی لباس میں تھے :

”یہ اینپٹر جمشید، اینپٹر کامران مرزا اور ان کے ساتھی ہیں

سر۔“

”اوہ اچھا۔ کیا ان لوگوں کو بھی بلایا گیا ہے؟“  
”صرف مجھے بلایا گیا تھا سر، لیکن میں نے ان کے بغیر  
آنا مناسب نہیں سمجھا، کیوں کہ تفتیش کے کام تو یہی کر

سکتے ہیں۔ ہم جیسے تو بس میزوں پر بیٹھ کر دستخط کرتے ہیں۔  
انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

”ٹھیک ہے شیخ صاحب۔ آپ نے اچھا ہی کیا کہ ان  
حضرات کو بھی لے آئے۔ یہ لوگ واقعی اس فن کے ماہر ہیں  
اور اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ  
ٹھانک ٹوئیاں ہی مارتے رہ جائیں۔ اور یہ لوگ اس عظیم  
چوری کا سراغ لگا لیں۔“ کرنل راضی نے جلدی جلدی کہا۔

”وقت سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا سر؛ تاہم ہم جو  
بھی کر سکتے ہیں۔ کریں گے۔ ملک کے لیے ہماری جانیں  
حاضر ہیں۔“

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ ہاں تو سب  
سے پہلے ہم اس چوری کی تفصیلات سنیں گے۔ مشربان ہاں  
میں نظر نہیں آ رہے۔ تفصیلات تو وہی بتائیں گے۔“ کرنل راضی  
نے جلدی جلدی کہا۔

”جی ہاں! ہم خود حیران ہیں۔ وہ اب تک کیوں نہیں آئے۔  
انھیں تو آپ سے پہلے یہاں پہنچنا تھا۔ آئی جی بولے۔“

”تب پھر۔“ پہلے ان کے بارے میں معلوم کریں۔“ کرنل صاحب  
کا منہ بن گیا۔ اُسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز گونجی، پھر  
ایک فوجی ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا :

”کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟ ایک فوجی آفیسر نے ہٹنا کر کہا۔

”وہ۔ سر۔ وہ۔ وہ ہٹکلیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟ اسی فوجی آفیسر نے جل کر کہا۔

عین اسی وقت ایک بار پھر دوڑتے قدموں کی آواز

سنائی دی:

”اوہو۔ کیا مصیبت آگئی ہے؟ کرنل راضی نے جھٹکا

میز پر زور سے مٹکا مارا۔

”ایک کھائی میں۔ ان کی لاش پڑی ہے سر۔ مشربون

کی۔

”کیا کہا۔ انجینئر صاحب کی لاش۔ ایک کھائی میں پڑی ہے،

اُت مالک۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کرنل راضی کانپ گئے۔

پھر وہ جلدی سے اٹھے اور باہر کی طرف پلکے۔ باقی سب نے

بھی باہر کا رخ کیا۔

باہر اسی طرح چل پھل تھی۔ بل جل تھی۔ رونق تھی۔

باتوں کا شور تھا، لیکن وہ اس جگہ سے نکلتے چلے گئے۔ اسی

فوجی کے تعاقب میں جس نے لاش ملنے کی اطلاع دی تھی۔

آخر میں منٹ تک تیز تیز قدم اٹھانے کے بعد فوجی رک

گیا اور اس نے ایک گہری کھائی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں

واقعی ایک انسانی جسم ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔

”کیا تم کھائی کے کنارے تک جا کر دیکھ چکے ہو؟ کرنل نے

سرد آواز میں کہا۔

”جی ہاں۔ بالکل!

”پھر۔ کیا اس میں زندگی کے آثار ہیں؟

”نہیں جناب۔ وہ بے چارے تو ز جانے کب کے اس دنیا

سے جا چکے ہیں۔

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے۔ ہمیں کھائی تک جانا ہی ہوگا۔

کرنل بولے۔

اب انھوں نے نیچے کی طرف چلنا شروع کیا۔ پانچ منٹ

انھیں اور لگے۔ تب کہیں جا کر وہ کھائی کے کنارے پر پہنچے،

اور یہ دیکھ کر وہ ساکت رہ گئے۔ کہ مرنے والے کا سر بالکل

پھٹ گیا تھا۔ بھیجہ باہر نکل آیا تھا۔ ایک بڑا سا خون آلود

پتھر لاش سے تھوڑی دور پڑا تھا۔

”غالباً یہ پتھر سر پر مارا گیا ہے۔“ فاروق بڑبڑایا۔

”ہاں! لیکن سوال یہ ہے کہ کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت

تھی؟ اس غریب کا قصور کیا تھا؟

”شاید اسے کوئی خاص بات معلوم ہو گئی تھی۔“ انپکٹر جمشید

بولے۔

”اوہ ہاں! اس کا امکان ہے۔ خیر۔ اب کیا کیا جائے؟

ایک فوجی افسر نے کہا۔

”ماہرین کو یہاں بلانا پڑے گا۔ اس معاملے کی باقاعدہ تفتیش کی جائے گی۔ کرنل بولے۔

”ہمیں بھی لاش کا معائنہ کرنے کی اجازت ہے سر؟ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

”ہاں ضرور۔ لیکن کسی چیز کو ادھر ادھر نہ کیجیے گا۔ جب تک کہ تصاویر نہ لے لی جائیں۔ کرنل بولے۔

”فکر نہ کریں سر۔“ محمود فوراً بولا۔

تفتیش ٹیم کو وائزلیس کے ذریعے جلد پہنچنے کا حکم دیا گیا، جب وہ ٹیم آئی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی فوجیوں پر مشتمل تھی۔ انھوں نے بہت نظم و ضبط کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ یہ کمرے دیکھتے رہے۔ جب ٹیم ہر طرح فارغ ہو گئی تو وہ آگے بڑھے۔

”آپ لوگ کتنی دیر لگائیں گے؟“ کرنل راضی بولے۔

”جی دس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔“

”تو پھر۔ کیا ہم ہل کی طرف چل پڑیں۔ آپ پہنچ جائیں گے۔“

”جی ہاں۔ ضرور۔“ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

”بہت بہت شکریہ!“ انھوں نے کہا اور واپسی کے لیے

قدم اٹھا دیے۔

”بھئی میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے بھی ان لوگوں کا ساتھ دینا ہے۔ سول انتظامیہ کی طرف سے مجھے ہدایات دی گئی ہیں کہ میں ہر ممکن ان کی مدد کروں اور ان کے ساتھ رہوں۔ تاکہ کسی بھی مرحلے پر ارضیں وقت پیش نہ آئے۔“ آئی جی صاحب بولے۔

”ضرور تشریف لے جائیں سر۔“ انسپکٹر کامران مرزا مسکرا دیے۔

ان کے جاتے ہی وہ لاش کی طرف بڑھے۔ چند منٹ تک وہ خاموشی سے اس کا جائزہ لیتے رہے، پھر محمود نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا:

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بے چارے برہان کو یہ

پتھر سر پر مار کر ہلاک کیا گیا ہے، لیکن سوال تو یہ

ہے کہ اسے یہاں تک لایا کس طرح گیا۔ وہ بھی اس بل چل

میں، لاش ابھی تک گرم ہے۔ ہل میں ان کا انتظار ہو

رہا تھا۔ گویا یہ قتل زیادہ دیر پہلے نہیں ہوا۔“

”صاف ظاہر ہے۔ انھیں کسی بہانے سے یہاں تک لایا

گیا اور پھر سر پر پتھر دے مارا گیا۔“ فرزانہ بولی۔

”ہاں! اس کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس قتل سے ظاہر ہے

کہ برہان صاحب نے کوئی خاص بات معلوم کر لی تھی۔ گیس کی

چوری کرنے والوں نے سوچا۔ راز فاش ہو گیا تو ان کا منصوبہ



درمیان میں رہ جائے۔ لہذا انہیں ختم کر دو۔ اور انہوں نے فوراً ہی اس پر عمل کر ڈالا۔

”مجھے ایک خیال اور آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مسٹر برٹن نے کوئی خاص بات معلوم نہ کی ہو۔ بلکہ انہیں صرف اس خطے کے پیش نظر ہلاک کیا گیا ہو کہ یہ یہاں کے بہترین انجنیر ہیں، ان کی مدد سے تفتیشی ٹیم جلد راز جان لے گئی۔“ فرحت نے جلدی جلدی کہا۔

”ہاں! یہ بات بھی دل کو لگتی ہے۔ لیکن بہر حال ہمیں ان میں سے کسی بات سے بھی کوئی فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا۔ ہمیں تو بس کسی طرح یہ معلوم کرنا ہے کہ گیس کس طرح چرائی جا رہی ہے اور کیوں۔ گیس کے اتنے بڑے ذخائر کسی جگہ منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”تو پھر یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے ہال کمرے میں چلنا چاہیے۔ معلوم تو ہو کہ اب ان لوگوں کا پروگرام کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا ہو گا۔“ انپکٹر جمشید نے کہا۔

اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ لہذا ہال میں پہنچ گئے۔ فوجیوں اور آئی جی صاحب کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔

”کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ آپ لوگ مسٹر برٹن کی کئی کس طرح پوری کریں گے؟“ انپکٹر جمشید بولے۔

”ہم نے ان کے نائب کو طلب کیا ہے۔“ کرنل راضی فوراً بولے۔

اسی وقت قدموں کی آواز آہری اور پھر ایک درمیانے قد کا آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ کافی پریشان نظر آ رہا تھا:

”مجھے راشد زہیری کہتے ہیں جناب۔ میں برٹن صاحب کا اسٹنٹ ہوں۔“

”تشریف رکھیے۔“ کرنل راضی بولے۔

وہ بیٹھ گئے۔ اور سوالیہ نظروں سے کرنل راضی کی طرف دیکھنے لگے:

”آپ کو یہ تو معلوم ہو چکا ہو گا کہ مسٹر برٹن۔“

”جی ہاں! سن چکا ہوں۔ ہمارا ساتھ بہت پرانا تھا۔ لہذا میں بہت ہی پریشان ہوں۔ اس قدر دکھ محسوس کر رہا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔“

”ہم آپ کے دکھ کو محسوس کر سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ کو پریشان کر رہے ہیں، لیکن کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔“ کوئی بات نہیں۔ انہوں نے فوراً کہا۔

”آپ ہمیں اس پوری کے بارے میں تفصیلات بتا سکتے

ہیں۔ آپ لوگوں کو اس کا علم کس طرح ہوا؟ مگر نل بولے۔

”جی ہاں! کیوں نہیں۔ اصل میں تو یہ بات سب سے پہلے میں نے ہی معلوم کی تھی۔“

”ادھو اچھا۔ تو پھر بتائیے۔“ وہ چونک اٹھے۔

”یہ کل صبح کی بات ہے۔ میں اپنے عملے کو چیک کرتا پھر

رہا تھا۔ اور آلات پر بھی نظر ڈال رہا تھا۔ اس کے بعد

مجھے پائپوں کی طرف جانا تھا، کیوں کہ بعض اوقات کوئی پائپ

معمولی سا ایک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس طرح گیس

ضائع ہونے لگتی ہے۔ لہذا ہمیں ایک چکر پائپوں کی طرف

بھی ضرور لگانا ہوتا ہے۔ میں کنٹرول روم میں داخل ہوا تو

وہاں موجود عملے کے چہرے دودھ کی طرح سفید تھے۔ میں

نے انہیں حیران ہو کر دیکھا اور پھر پوچھا:

”کیوں بھئی۔ خیر تو ہے۔ تم لوگوں نے کوئی سانپ وانپ

تو نہیں دیکھ لیا؟“

”اس سے بھی کہیں زیادہ خوف ناک چیز ہم نے دیکھی ہے

سر۔ فورین بولا۔

”اس سے بھی زیادہ خوف ناک چیز۔ تہ۔ تو کیا تم نے

شیر دیکھ لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ دراصل میری عادت ان

سے ہنسی مذاق کرتے رہنے کی ہے۔

”نہیں جناب۔ ایسے۔ ہم آپ کو دکھاتے ہیں۔“

وہ مجھے مقدار بتانے والے حصے کی طرف لائے۔ وہاں بہت

بڑے بڑے میٹر نصب کیے گئے ہیں۔ جو مختلف کنوؤں سے گیس

کی مقدار بتاتے ہیں۔ اس مقدار کو سامنے رکھ کر ہی ہمارے

حکمے کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ گیس کے یہ ذخائر

پورے ملک کے لیے تین سو سال تک کام دیں گے۔

’ادھر دیکھئے سر۔ فورین کی کانپتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

اس کی انگلی میٹروں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے

دیکھا، پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا دکھانا چاہتا ہے،

لیکن پھر جوں ہی بات سمجھ میں آئی۔ میں دھک سے رہ

گیا۔ مارے خوف کے میری پیچ نکل گئی۔ تمام کنوؤں کی

مقدار بتانے والی سوئیاں ہر روز ایک انچ کے سویں تھتے

کے قریب نیچے گرتی ہیں۔ یہ معمول بہت عرصے سے جاری

ہے۔ ہم اس کو ہر روز چیک بھی کرتے ہیں، لیکن اس

روز۔ میں اب کیا بتاؤں۔ کیسے بتاؤں۔ اس روز۔ سوئیاں

ایک سال کی مقدار کے برابر نیچے گر چکی تھیں۔ یہ ایک

اتنا حیرت انگیز واقعہ تھا کہ مجھے پکڑ آگیا۔ میں دھڑام سے

گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں لایا گیا تو میٹر برٹن

مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ بھی کسی لاش کی طرح

سفید نظر آ رہا تھا۔

’یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے راشد؟‘

’میری سمجھ سے باہر ہے سر۔‘

’ابھی تو تم ایک اور خبر سننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔‘  
وہ بولے۔

’جی کیا مطلب۔ کیسی خبر؟‘

’تم صرف نصف گھنٹا بے ہوش رہے ہو۔ اور اس نصف گھنٹے میں سوئیاں دس سال کے برابر نیچے گر گئی ہیں۔‘  
’کیا!؟ میں چلا اٹھا۔‘

’آس کے بعد برہان صاحب نے میٹنگ بلائی۔ سب سر جھٹک کر بیٹھ گئے اور پھر یہی فیصلہ کیا گیا کہ اپنے محکمے کے وزیر کو اطلاع دی جائے! چنانچہ انھیں اطلاع دی گئی۔ وہ دوڑے آئے۔ اس وقت تک ایک سو سال کے برابر مقدار کم ہو چکی تھی۔ وزیر کے ہوش اڑ گئے۔ یہ بات تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی جاسکتی تھی۔ انھوں نے فوراً وزیر اعظم کو اطلاع دی۔ انھوں نے صدر صاحب کو اطلاع دی صدر صاحب نے فوراً یہ معاملہ فوج کے حوالے کر دیا، اور محکمہ سراغ رسانی سے آپ لوگوں کو طلب کر لیا۔ لیکن آپ لوگ یہاں آئے تو مسٹر برہان اس دنیا میں نہیں رہے۔‘

’انھیں کسی نے ہلاک کر دیا۔ افسوس۔ برہان صاحب جیسے ذمے دار آدمی آج کل بہت کم ملتے ہیں۔ وہ بہت اچھے تھے۔ بہت۔‘  
’اور اس وقت تک مقدار بتانے والی سوئیاں کہاں ہیں؟‘  
’ڈیڑھ سو سال کے برابر گئیں چرائی جا چکی ہے۔ اور دو دن تک یہی حالت رہی تو کونئیں خالی ہو جائیں گے۔ ہمارا ملک اس بڑی دولت سے محروم ہو جائے گا۔ ایندھن کے نرخ آسمان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ پورے ملک کی صنعتیں بحران کا شکار ہو جائیں گی۔ مصنوعات کی پیداوار رک جائے گی۔ غرض سارے ملک کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ راشد زبیری کہتے چلے گئے۔‘

’گو کیا اب ہمارے پاس صرف ڈیڑھ سو سال کے لیے گیس کے ذخائر رہ گئے ہیں! انیسٹر کا مرزا بول اٹھے۔‘

’جی نہیں۔ وہ تو اس صورت میں رہ سکتے ہیں نا۔ جب کہ پھوری روک دی جائے۔ گیس تو برابر پھوری ہو رہی ہے۔ اور اگر ہم سراغ نہ لگا سکے۔ تو کل تک گیس ختم ہو جائے گی۔‘  
’اور؟ وہ دھک سے رہ گئے۔ اس قدر خوفناک بات شاید انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار سنی تھی۔‘

’اور آپ تمام پائپ لائنیں اور تمام کنکشن وغیرہ چیک کر چکے ہیں؟‘



"ہمارے عملے نے تمام کام چھوڑ کر کل سے اس وقت تک کام ہی کیا ہے۔ اور تو کوئی کام کیا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ میں اور برٹن صاحب بھی اسی کام میں لگے رہے ہیں، لیکن افسوس۔ ہم ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ گیس کس جگہ سے اڑائی جا رہی ہے۔"

"ہوں! واقعی۔ بہت ہی خوف ناک صورت حال ہے۔ کرنل فکر مند انداز میں بولے۔

"سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں۔ کس طرح اس مقام کا سراغ لگائیں۔ ہمیں تو اس کا ذرا بھی تجربہ نہیں ہے۔ یہ کام تو بس آپ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔" انپکٹر جمشید بولے۔

"ہمارے چند ماہرین۔ آپ کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ وہ اس جگہ سے لے کر اس جگہ تک جائیں گے۔ جہاں سے پورے ملک کے شہروں کو پائپ تقسیم کیے گئے ہیں۔ درمیان میں کہاں کہاں جوڑ ہیں۔ موڑ ہیں۔ گلشن ہیں۔ وہ آپ لوگوں کو بتاتے جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"لیکن اس سارے نظام کو تو آپ لوگ پہلے ہی چیک کر چکے ہیں۔" خان رحمان نے اعتراض کیا۔

"ہاں! لیکن ہم ایک اور مرتبہ چیک کرنا چاہتے ہیں۔"

"کرنل صاحب۔ میری ایک تجویز ہے۔" انپکٹر جمشید نے کچھ

سوچ کر کہا۔

"جی فرمائیے۔" انھوں نے فوراً کہا۔

"آپ کے آدمی ان لوگوں کے ساتھ پائپ لائنوں کی چیکنگ کے لیے جائیں۔ اور ہم مسٹر برٹن کے قتل کی تفتیش کریں۔"

"بھلا ان کے قتل کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بے چارے تو قتل ہو چکے، تفتیش انھیں لوٹا تو نہیں لائے گی۔" کرنل بولے۔

"آپ میرا اشارہ نہیں سمجھتے۔" انپکٹر جمشید مسکرائے۔

"دراصل میں فوجی آدمی ہوں نا۔ اور آپ سراغ رساں۔" کرنل راضی مسکرائے۔

"میں عرض کرتا ہوں۔ جس کسی نے مسٹر برٹن کو قتل کیا ہے۔ وہ ضرور اس راز سے واقف ہے۔ کہ گیس کس طرح چرائی جا رہی ہے۔ اور مسٹر برٹن بھی بہت جلد یہ بات معلوم کر لیتے۔ لہذا انھیں ختم کر دیا گیا۔ یا شاید۔ انھوں نے راز معلوم کر لیا تھا۔ جس کی بنا پر انھیں موت کے گھاٹ اتارنا پڑا۔ اب اگر ہم اس آدمی کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ تو گویا ہم نے چوہی کے طریقہ کار کا سراغ لگا لیا۔"

"آپ کی بات سے میں پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ اب ہمیں وقت ضائع نہیں

کرنا چاہیے۔ ہماری ٹیم ابھی اور اسی وقت باہرین کے ساتھ روانہ ہو رہی ہے۔ آپ جانیں آپ کا کام۔ کرنل راضی اٹھتے ہوئے بولے۔

”شکریہ جناب۔ مسٹر راشد ہمیں صرف ایک بات بتا کر آپ ان لوگوں کے ساتھ جا سکتے ہیں۔“

”جی فرمائیے۔“

”مسٹر برٹن کے قتل کو ابھی زیادہ دیر نہیں گزری۔ گویا چند گھنٹے پہلے وہ زندہ تھے۔ اس وقت وہ کہاں تھے اور کس کے ساتھ تھے؟“

”ہم لوگ تمام رات جاگتے رہے۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوئے۔ نیند تو ویسے ہی کوسوں دور جا چکی تھی، صبح ہم نے ناشتا بھی چیکنگ کرتے کرتے کیا تھا۔ ایسی حالت میں برٹن صاحب نے مجھ سے چونک کر کہا تھا کہ انھیں ایک بہت ضروری بات یاد آ گئی ہے۔ وہ کنٹرول روم میں جا رہے ہیں۔ آپ برابر آگے بڑھتے رہیں۔ یہ کہہ کر وہ پلٹے اور چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے تو انھیں دیکھا نہیں، پھر تو ان کی لاش ملنے کی ہی خبر ملی تھی۔“ راشد زبیری نے جلدی جلدی کہا۔

”وہ وہاں سے تنہا روانہ ہوئے تھے۔ یا ان کے ساتھ

کوئی اور بھی تھا۔“

”وہ ہم میں سے صرف ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ راشد زبیری نے بے چین ہو کر کہا۔

”کیوں۔ خیریت تو ہے۔ آپ پریشان ہو گئے۔“

”اس آدمی کا خیال تو مجھے بھی اسی وقت آیا ہے۔ وہ۔ وہ بھی مجھے اس وقت کے بعد نظر نہیں آیا۔“

”اور۔ اس کا نام۔“

”صوبے خان۔“

”گویا ایک اور اُلجھن۔ آپ مہربانی فرما کر ہمارے ساتھ ایک آدمی کر دیں۔ جو ہمیں اس جگہ تک لے جا سکے۔ جہاں سے مسٹر برٹن کنٹرول روم کی طرف جانے کے لیے پلٹے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ ہمیں مسٹر صوبے خان اور برٹن صاحب کے گھروں تک لے جا سکیں۔“

”ہمارے رہائشی فلیٹس اور کونٹینیاں یہاں نزدیک ہی ہیں۔ اور وہ جگہ بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ جہاں سے برٹن صاحب نکلے تھے۔ نذیر بیگ۔ تم ان کے ساتھ جاؤ۔“

”بہت بہتر جناب۔“ دروازے پر موجود لوگوں میں سے ایک نے کہا۔

کرنل راضی اپنی کرسی سے اٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی

چھڑی اٹھائی اور اس کے سرے کو اپنی پنڈلی پر مارتے ہوئے  
بولے :

” چلیے مسٹر راشد !

وہ ان کے ساتھ کمرے سے نکل گئے۔ اب ہال میں ان  
کے ساتھ صرف نذیر بیگ رہ گیا۔ یہ پتلا دبلا اور لمبے قد کا  
آدمی تھا :

” ہمیں بھی وقت ضائع کیے بغیر کام شروع کرنا چاہیے —  
حالات انتہائی ہولناک ہیں۔ خان رحمان بولے۔

نذیر بیگ کی رہنمائی میں وہ پاپ لائن پر اس جگہ پہنچے۔  
جہاں سے مسٹر برٹن کوئی بات یاد کر کے پلٹے تھے۔  
” تو اس جگہ سے واپس ہوتے تھے اور ان کے ساتھ صوبے

خان تھا۔

” جی ہاں ! نذیر بیگ نے کہا۔

” آپ کے خیال میں وہ کہاں گئے ہوں گے ؟

” میں نہیں جانتا جناب۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

” اچھا۔ اس وقت کتنے بجے ہوں گے ؟

” غالباً صبح کے نو بجے تھے۔

” ٹھیک ہے۔ سمت تو ہمیں معلوم ہے۔ خود انہوں نے بھی

یہ کہا تھا کہ وہ کنٹرول روم جا رہے ہیں۔ لہذا ہم اس جگہ سے

سیدھے کنٹرول روم جائیں گے۔ اور راستے میں پاپ لائن پر نظر  
رکھیں گے۔

” جی بہتر۔ آئیے۔

وہ وہاں سے کنٹرول روم کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کی  
نظریں پاپ لائن سے چپکلی ہوئی تھیں۔ اچانک نذیر بیگ اوندھے  
منہ گرا۔ وہ بوکھلا اٹھے۔ اس کے گرنے کی وجہ ان کی سمجھ  
میں نہیں آ سکی تھی۔



## اس کا قاتل

انہوں نے فوراً چاروں طرف دیکھا۔ اس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ فائر کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ کوئی پتھر وغیرہ بھی نذیر بیگ کی طرف آتا نظر نہیں آیا تھا۔ پھر۔ آخر وہ کیوں گر گیا تھا :

مشر نذیر بیگ۔ خیر تو ہے۔ آپ کو کیا ہوا؟ انپکٹر جمشید نے پریشان آواز میں کہا۔

لیکن نذیر بیگ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ نہ اس کے بدن میں حرکت ہوئی۔ اب تو انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ انپکٹر کامران مرزا نے فوراً اسے سیدھا کیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ کہتے ہیں رہ گئے، چہرہ بالکل نیلا ہو چکا تھا اور وہ مر چکا تھا۔

”ارے۔ کہیں کسی زہریلے کیڑے نے تو نہیں کاٹ کھایا اسے۔“ پروفیسر چلائے۔

”ارے باپ رے۔ زہریلا کیڑا۔ زمین کی طرف تو ہم نے توجہ دی ہی نہیں۔“

انہوں نے فوراً زمین کی طرف دیکھا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں، لیکن کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ ایسے میں انپکٹر جمشید چلائے۔ محمود۔ فاروق۔ دوڑو۔ راشد زہری صاحب کو فوراً یہاں تک لے آؤ۔ وہ جہاں بھی ہیں۔ جس حال میں بھی ہیں۔ پہلے انہیں اس طرف آنا چاہیے۔ ہمارا پٹر اسرار ترین، چالاک ترین اور خوف ناک ترین دشمن چاہتا ہے۔ ہم کنٹرول روم کا رخ نہ کرنے پائیں۔ یہ الفاظ انہوں نے حلق چھا کر کہے۔ حالاں کہ اگر الفاظ صرف محمود اور فاروق کو سنانا تھے تو وہ ان کے بالکل نزدیک موجود تھے۔ انہوں نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا، لیکن پھر ان کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ پائپ لائن کے ساتھ سرپیٹ دوڑتے چلے گئے۔

”اس لاش کے گرد ایک دائرہ بنا لو۔ مگر لاش کی طرف۔ مزہ چاروں طرف۔ اور کندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہونے چاہئیں۔“ انہوں نے نیا حکم دیا۔

”یہ۔ جمشید۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ خان رحمان نے گہرا کر کہا۔

”سنا نہیں خان رحمان۔“ انپکٹر جمشید فرماتے :

خان رحمان کی سٹی گم ہو گئی۔ انھوں نے اس لمحے میں ان سے کبھی بات نہیں کی تھی ؛ تاہم انھوں نے بُرا نہیں مانا۔ سب کے ساتھ وہ بھی دائرے کی صورت میں کھڑے ہو گئے۔ انپکٹر جمشید اس دائرے کے اندر لاش کے پاس موجود تھے :

”آپ نے اندازہ لگایا انپکٹر کامران مرزا۔ میں نے ایسا کیوں کیا ؟“

”ہاں ؛ نذیر بیگ کسی کیرٹے کے کاٹے سے نہیں مرا۔ اس کی موت زہر سے واقع ہوئی ہے۔ اور زہر اس کے جسم میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ ہمارے آس پاس۔ بہت نزدیک کوئی دشمن موجود ہے۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ نکالا۔ وہ ہمیں بھی زہر کا شکار کر سکتا ہے۔ لیکن اب۔ وہ جوں ہی حرکت کرے گا۔ ہم میں سے کوئی۔ یا چند ایک اسے دیکھ لیں گے۔ وہ بولے۔“

”بہت خوب جمشید۔“ پروفسر داؤد بولے۔

”آنکھیں کھلی رہیں۔ کان بیدار رہیں۔ میں نہیں چاہتا۔ وہ یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائے۔ یا ہم میں

سے کسی کی موت کا سبب بن جائے۔“ انپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

ان سب کی نظریں چاروں طرف دور دور تک پڑنے لگیں۔ اچانک انپکٹر کامران مرزا نے دوڑ لگا دی۔ وہ چونکے، اسی وقت انپکٹر جمشید گرے :

”خبردار۔ باقی لوگ اپنی جگہ موجود رہیں۔“

انپکٹر کامران مرزا نے دو تین لمبی لمبی چلائیں لگائیں۔ اور ایک چٹان کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

”سب لوگ اس طرف نہ دیکھیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی سمت میں دیکھے۔ کہیں ہم بھی زہر کا شکار نہ ہو جائیں۔“ اسی وقت انپکٹر کامران مرزا کی آواز گونجی :

”یہ اب میرے قابو میں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ یہیں لے آئیں۔“

جلد ہی انپکٹر کامران مرزا ایک آدمی کو گردن سے پکڑے آتے نظر آئے۔ اس کے دونوں ہاتھ انھوں نے دوسرے ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھے۔ کلائیوں کے پاس سے انھوں نے دونوں ہاتھوں کو اس طرح پکڑا تھا کہ وہ پورا زور لگانے کے باوجود چھڑا نہ سکا۔

”چٹان کے اوپر سے ذرا سا سر اٹھا کر اس نے بلو پاپ

کے ذریعے نذیر بیگ کا کام تمام کیا ہے۔" نزدیک آنے پر انھوں نے کہا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ باندھ لو بھی اسے۔"

آصف اور آفتاب نے اسے ریشم کی ڈوری سے باندھ دیا۔ پیر آزاد رہنے دیے۔ اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ محمود اور فاروق راشد زہیری کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ راشد زہیری کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار تھے:

"لگ۔ کیا ہوا جناب؟"

"ایک اور قتل۔ لیکن اس مرتبہ ہم نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔" اداہ! اس کے منہ سے نکلا اور پھر اس کی نظریں قاتل پر جم گئیں۔ وہ زمانے بھر کی حیرت آنکھوں میں سیٹھ اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس کو چھوڑیں۔ اور ہمارے ساتھ فوراً کنٹرول روم چلیں۔" انسپکٹر جمشید نے اسے یوں گھورتے پا کر کہا۔

"کنٹرول روم میں۔ لیکن جناب میں تو کرنل صاحب کے ساتھ پائپ لائن کے ساتھ ساتھ جا رہا ہوں۔ اور اب وہ میرے انتظار میں رکے کھڑے ہوں گے۔"

"مسٹر زہیری۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ بے شک

نہ جائیں۔ لیکن۔ ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی کر دیں۔ جس کو کنٹرول روم سے پوری طرح واقفیت ہو۔"

"خیر تو ہے۔ آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"باتوں کا وقت نہیں ہے۔ انھوں نے بھٹا کر کہا۔

"چند منٹ تک دو آدمی یہاں پہنچ جائیں گے۔ مجھے اجازت ہے۔" اس نے کہا۔

"بالکل اجازت ہے۔" وہ بولے۔

اور راشد زہیری نے پھر اسی سمت میں دوڑ لگا دی۔ پھر دو ماہر ان کی طرف آتے نظر آئے۔ انھیں ساتھ لے کر وہ کنٹرول روم میں پہنچے۔ نذیر بیگ کا قاتل ان کے ساتھ تھا اور پوری طرح نظروں میں تھا۔

کنٹرول روم کوئی چھوٹی سی جگہ نہیں تھی۔ بہت لمبا چوڑا پلانٹ تھا۔

"آپ دونوں کنٹرول روم کے تمام معاملات کو سمجھتے ہیں؟" جی ہاں جناب۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔

"اچھا تو پھر۔ جو ہم کر رہے ہیں۔ غور سے سنیں۔ پورے ملک کو گیس کی سپلائی بند کر دیں۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ سپلائی بند کر دیں۔ نہ صرف وہ دونوں



بلکہ ان کے اپنے ساتھی بھی حیران رہ گئے۔

”انپکٹر جمشید۔ یہ آپ نے کیا کہا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی“

”بات ابھی سمجھ میں آ جائے گی۔ پہلے سپلائی بند کر دی جائے۔“ انپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

”اوہ۔ اوہ۔ میں سمجھ گیا۔ واقعی۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”لیکن جناب۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”کیوں۔ کیوں نہیں کر سکتے؟“ انپکٹر کامران مرزا نے تیز آواز میں کہا۔

”اس لیے کہ۔ پورے ملک میں اندھیر چ جائے گا۔ پورا کا پورا ملک شدید پریشانی اور الجھن میں مبتلا ہو جائے گا۔“

”پورا نہیں۔ ان کی یہ پریشانی اور الجھن ملک کے مفاد میں ہو گی۔ میں کہتا ہوں۔ سپلائی بند کر دو۔“ انپکٹر جمشید پوری قوت سے چلائے۔

دونوں بڑی طرح بوکھلا گئے۔ اور پھر ایک طرف دڈے۔ انھوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ جہاں جاکر وہ رکے۔ وہاں۔ ڈیوٹی پر قریباً دس آدمی موجود تھے۔

”پورے ملک کی سپلائی لائن بند کر دیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”کیا کہا۔ بند کر دیں۔“

”باتوں میں وقت نہ ضائع کرو۔ حکم کی تعمیل کرو۔ ملک کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ کل تک ہم بقایا ڈیڑھ سو سال کی گیس کھو دیں گے۔“ انپکٹر جمشید گرجے۔

”لیکن جناب۔ سپلائی لائن بند کرنے سے کیا ہو گا۔ کیا اس طرح یہ عظیم چوری رک جائے گی۔“

”پہلے سپلائی لائن بند کر دو۔ بے فکر رہو۔ تم لوگوں کو کوئی کچھ نہیں کہ سکے گا۔ ذمے داری میری ہو گی۔“

آخر وہ مشینوں پر جھک گئے۔ انھوں نے کئی لوہے کے بڑے بڑے لٹو سے گھمائے اور ایک منٹ بعد انھوں نے کہا:

”سپلائی روک دی گئی۔“

”خان رحمان۔ تم اور شوکی یہاں موجود رہو۔ کسی کو بھی سپلائی لائن ہرگز چالو نہ کرنے دی جائے۔“

”بہت بہتر۔ وہ ایک ساتھ بولے۔

”باقی لوگ میرے ساتھ آئیں۔ ہمیں مقدار بتانے والے میٹروں کی طرف جانا ہے۔“

”آئیے۔“ دونوں ماہر ایک ساتھ بولے۔

تیز تیز قدم اٹھاتے وہ میٹروں کے پاس پہنچ گئے۔

”اب آپ ان پر نظریں جمادیں۔ اور ہمیں یہ بتائیں۔  
کیا اب بھی گیس چوری ہو رہی ہے۔ یا نہیں؟“ انیکٹر  
جھپٹہ بولے۔

”اوہ! ان کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔ دل  
دھک دھک کرنے لگے۔

ان کے چہروں پر بھی حیرت نمودار ہوئی۔ نظریں میٹروں  
پر جم گئیں۔ ساتھ میں انھوں نے گھڑیوں کی طرف بھی دیکھا،  
اس عالم میں پانچ منٹ گزر گئے۔ اچانک ان میں سے ایک  
نے کہا:

”میرا خیال ہے، اب گیس چوری نہیں ہو رہی، تاہم مزید پانچ  
منٹ بعد یقین ہو گا۔“

”ہم پانچ منٹ اور صبر کر لیتے ہیں۔ ہمارا کیا جاتا ہے؟“  
فادوق نے خوش ہو کر کہا۔

اب ان کے دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگے تھے۔  
پانچ منٹ اور گزر گئے۔ اور وہ دونوں چلا اٹھے:

”اب یہ بات یقینی ہے۔ چوری رک گئی ہے۔“  
”وہ مارا۔ اب ہم اطمینان سے تفتیش کر سکیں گے۔“

پہلے یہ گجراہٹ ہم پر سوار تھی۔ کہ کل تک بقایا ڈیڑھ سو  
سال کے لیے کافی ہو جانے والی گیس بھی ختم ہو جائے

گی۔ اب ہم نے اس گجراہٹ سے نجات پالی۔ اور اس  
کا مطلب یہ بھی ہے کہ سپلائی لائن میں سے ہی کسی جگہ  
چوری کی جا رہی تھی۔“

”حیرت ہے۔ کمال ہے۔ اس فیلڈ کے ماہر ہم ہیں۔

اور یہ بات ہمارے ذہن میں نہیں آئی۔“ ان دو ماہرین  
میں سے ایک نے کہا۔ باقی لوگ بھی کم حیران نہیں تھے۔  
چہروں پر مسکراہٹیں بھی نظر آنے لگی تھیں:

”لیکن۔ ڈیڑھ سو سال کی گیس کہاں گئی؟ ایسے میں آفتاب  
بولا۔

”شاید۔ ہم اس گیس کو ضائع کر چکے ہیں۔ جوں ہی اس  
چوری کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ اگر ہم یہ سپلائی لائن بند  
کر دیتے تو اتنا نقصان نہ ہوتا۔“

”تو کیا۔ آپ کے خیال میں سازش کرنے والوں نے  
گیس کو ضائع کیا ہے؟“

”اور کیا۔ وہ اتنی گیس کہاں قید کر کے رکھ سکتے تھے۔“  
”افسوس۔ افسوس۔“ پروفیسر داؤد بولے۔

”اور ان کے ہاتھ آیا کیا؟“

”ملک کے دشمن یہ نہیں سوچا کرتے کہ ان کے ملک دشمن  
منصوبوں سے ان کے ہاتھ کچھ آئے گا یا نہیں۔ وہ تو بس

”ملک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”پلیے۔ ایک اطمینان تو ہوا۔ اب کیا کرنا ہے؟“

”پلیے ہم کرنل راضی، آئی جی صاحب اور راشد زبیری صاحب کو یہ خوش خبری سناتے ہیں چل کر۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔“

”آپ لوگ سیلائی لائن کے پاس موجود رہیں۔ سیلائی لائن بالکل بند رہے گی۔“

”فکر نہ کریں جناب۔“

انہوں نے خان رحمان اور شوکی کو ساتھ لیا اور پائپ لائن کی طرف چل پڑے۔ ان کے قدم اس قدر تیز آٹھ رہے تھے کہ دوڑنے کا گمان ہوتا تھا۔ پائپ لائن کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے لوگوں نے آخر ان کی طرف مڑ کر دیکھا اور رک گئے۔

”جوں ہی نزدیک پہنچے۔ آئی جی صاحب بول اٹھے :

”معلوم ہوتا ہے۔ کوئی خاص خبر لاتے ہیں۔“

”جی۔ ہاں۔ کیا کریں۔ مجبوری ہے۔“ فاروق منٹایا۔

”مجبوری کیسی؟“ کرنل راضی کے لیے میں حیرت تھی۔

”جی۔ بہت دل چسپ مجبوری۔“ آفتاب مسکرایا۔

”لیجیے۔ اب مجبوریاں بھی دل چسپ ہونے لگیں۔“ محمود نے مزہ

بنایا۔

”آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا؟“

”جتنی کچھ ہمیں بھی تو بتا دو۔ کیا چوری کا سراغ مل گیا؟“

”آئی جی صاحب نے مذہب بنا کر کہا۔“

”نہیں سر۔ ابھی تو ہم سراغ لگانے کے لیے نکلے ہی نہیں،

البتہ ہم نے ایک بہت بڑی کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔“

”وہ کیا؟“ کرنل راضی جلدی سے بولے۔

اور جب انہوں نے کامیابی کی تفصیل سنائی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے :

”ملک۔ کمال ہے۔“ کرنل راضی نے یہ کہتے ہوئے دائیں ہاتھ

میں پکڑی پکڑی کو پنڈلی پر مارا۔ شاید یہ ان کی عادت تھی۔

”اس کا مطلب ہے۔ ہم جس گجراہٹ کا شکار تھے۔ فی الحال

اس سے تو محفوظ ہو گئے۔ بے شک ایک بہت عظیم نقصان ملک

کا ہو چکا ہے، لیکن اتنا ہی عظیم نقصان جو ہونے والا تھا۔

وہ ہونے سے بچ گیا ہے۔“ کرنل راضی جلدی جلدی بولے۔

”جی ہاں! اب پورے ملک کو گیس کی سیلائی اس وقت تک

بند رہے گی۔ جب تک کہ ہم اس جگہ کا سراغ نہیں لگا لیتے،

جس جگہ سے گیس چوری کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ ابھی ہمیں

بھرموں کو گرفتار بھی کرنا ہے۔ اور شاید ہمارے ہاتھ سراسر آ

گیا ہے۔ میرا اشارہ نذر بیگ کے قاتل کی طرف ہے۔“



اب ہم اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔

”گویا اب ہم بھی اپنی کوشش ترک کر سکتے ہیں۔ کرنل بولے۔

”جی ہاں! اب تو گیس پائپ میں آہی نہیں رہی۔ سڑاخ کس طرح لگ سکتا ہے۔ اب تو سڑاخ دوسرے ہی طریقے سے لگایا جا سکتا ہے۔“

”تب پھر ہم بھی مسٹر برٹن کے دفتر میں چلتے ہیں۔ کرنل راضی نے کہا۔

”ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔“

وہ واپس پلٹے۔ دفتر میں آئے۔ انپیکٹر جشید نے نذیر بیگ کے قاتل کو پیش کرنے کی ہدایات دیں۔ وہ آیا۔ اور بے خوف سا کرسی پر بیٹھ گیا:

”تم نے بلو پائپ کے ذریعے نذیر بیگ کو ہلاک کیا ہے۔ اس بات کا اقرار کرتے ہو؟ انپیکٹر کامران مرزا نے سوالات کی ابتدا کی۔

”بالکل اقرار کرتا ہوں۔“

”مسٹر برٹن کو بھی تم نے ہی ہلاک کیا تھا؟“

”ہاں! میں نے انہیں خبر سنائی تھی کہ میں نے اس کو قاتل میں ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ آپ بھی چل کر دیکھ لیں! جہاں چہ وہ میرے ساتھ وہاں گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ انہیں دھکا

دیا۔ وہ مذ کے بل گرے۔ پتھر تیار تھا۔ بس میں نے اٹھایا اور ان کے سر پر دے مارا۔“

”ہمیں۔ لیکن تم ہو کون۔ اور یہاں تمہارا کیا کام؟“

”میں بھی مسٹر برٹن صاحب کا ایک ماتحت ہوں۔ اور جب یہ سارا پلانٹ نصب کیا جا رہا تھا۔ اس وقت میں بھی یہاں تھا۔ لہذا میں بھی پوری طرح واقفیت رکھتا ہوں۔“

”تب تو تم یہ بھی بتا سکتے ہو کہ چوری کس جگہ سے کی گئی ہے؟“

”جی نہیں۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں۔ اس نے کہا۔

”ہوں خیر۔ فکر نہ کرو۔ وہ ہم خود تلاش کر لیں گے۔ تم تو صرف یہ بتا دو کہ کس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”میں اسے نہیں جانتا۔ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”یہاں اس کے کچھ اور بھی ساتھی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس نے اس پلانٹ کے کئی آدمی خفیہ طور پر توڑے ہیں اور بھاری رقم کے لالچ دے کر اپنے ساتھ ملائے ہیں۔ صرف مجھے اس نے پانچ لاکھ روپے دیے تھے۔“

”اوہ۔ لیکن کیسے۔ تمہیں یہ کیوں معلوم نہیں کہ وہ کون ہے۔“

”اس نے بذریعہ خط و کتابت یہ سارا کام کیا۔ خطوط ہمیں یہاں بعض جگہوں پر پتھروں کے نیچے مل جاتے تھے۔ ان پر

ہدایات درج ہوتی تھیں۔ جب میں نے اس کے لیے کام شروع کر دیا تو نوٹوں کا لفاظ بھی مل گیا۔  
 "اس نے اور کس کس کو توڑا ہے؟"  
 "ماہرین میں کچھ لوگ موجود ہیں۔ میں ان کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔ کرنل صاحب۔ اس کے ساتھ چند فوجی بھیج دیں۔ تاکہ یہ لوگ ان باقی غداروں کو بھی لے آئیں۔"  
 "جی ہاں! کیوں نہیں؟" وہ بولے۔

فوجی اسے لے کر چلے گئے، لیکن جب وہ واپس لوٹے تو ان کے ساتھ صرف نذیر بیگ کا قاتل تھا۔ اور چہروں پر حیرت تھی۔

## چھ ٹکڑیاں

"کوئی اور نجر سننے کے لیے تیار ہو جائیں؟" مکین بولا۔  
 "کیا کیا جائے۔ ہمارا مقدر ہی یہ ہے! آفتاب نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی زبردست سازشی ذہن اپنا حال چاروں طرف پوری طرح پھیلاتے ہوئے ہے اور ہم اس کے اشاروں پر ناپچ رہے ہیں۔ شوکی کی آواز ابھری۔

"اوہ۔ حیرت ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی آچکی ہے۔"  
 انپیکٹر کا مران برزا بولے۔

"اور میں تو شروع سے ہی یہ محسوس کر رہا ہوں۔ انپیکٹر جمشید مسکرائے۔

اتنے میں وہ لوگ نزدیک آگئے۔ ایک فوجی نے کہا:

"وہ لوگ غائب ہیں۔ ان کا کہیں پتا نہیں۔"

"ان کے نام وغیرہ آپ لکھوا سکتے ہیں؟ انپیکٹر جمشید نے نذیر بیگ

کے قاتل سے کہا۔

”ہاں کھوا سکتا ہوں، لیکن اب وہ آپ کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔“

”آپ کا نام کیا ہے مرثیٰ؛ انپکٹر کامران مرزا نے جھٹا کر کہا۔“

”جیتا۔“ اس نے منہ چڑایا۔

”آدمیوں والا کوئی نام نہیں ملا تھا تمہیں؟“ آفتاب نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

”یہ نام میرا اپنا رکھا ہوا ہے۔ ماں باپ نے تو شریف خالد نام رکھا تھا۔“

”ہوں؛ لیکن پچوں کہ تم شریف نہیں نکلتے۔ لہذا تم نے اپنا نام ہی بدل دیا۔“ کمسن بولا۔

”یہی سمجھ لیں۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”اپنے خدار ساتھیوں کے نام کھوا دو۔“

اس نے آٹھ نام کھوا دیے۔ اس کے بعد وہ آٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے میں انپکٹر کامران مرزا نے کرنل صاحب کی طرف دیکھا:

”چیتے کو کڑی نگرانی میں رکھو ایسے گا۔“

”نکھر ذکر کریں۔ اس کے تو فرشتے بھی فرار نہیں ہو سکیں گے۔ جو لوگ فرار ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں تو ہمیں

معلوم ہی نہیں تھا۔“

”ہوں؛ آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ دوسرے یہ کہ کنٹرول روم کو فوج کی نگرانی میں رکھا جائے۔ پہلائی لائن ہر حالت میں بند رہے گی۔ اگر ہمارے چالاک دشمن نے اسے کسی طرح کھوا دیا۔ تو پھر ہم بقیہ گیس سے بھی محروم ہو جائیں گے۔“

اس وقت تو خیر ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ڈیڑھ سو سال کے لیے تو گیس موجود ہے ہی۔ اس دوران ہم گیس کے مزید تقویٰ ذخائر تلاش کرتے رہیں گے اور اللہ نے چاہا تو تلاش کر ہی لیں گے۔“

انہوں نے سر ہلا دیے اور وہ سب ہال سے باہر نکل آئے:

”اب ہم خود کو قدرے پُر سکون محسوس کر رہے ہیں۔“

”میری ایک تجویز ہے۔ جوشید۔ ایسے میں پروفیسر داؤد بولے۔“

”اور وہ کیا؟“

”دشمن وار کرنے سے نہیں چو کے گا۔ وہ ہمارا ذاتی دشمن نہیں ہے۔ ہمارے پورے ملک کا دشمن ہے۔ وہ کس طرح برداشت

کر سکتا ہے کہ اس کے جھٹے میں صرف نصف کامیابی آئے،

اور اس کی نصف کامیابی کو ہم لے اڑیں۔ لہذا وہ رات

کو اس بات کی کوشش ضرور کرے گا کہ کسی طرح پہلائی لائن



کھلوا دے۔ تاکہ صبح تک نصیب گیس اور ضائع ہو جائے۔

”آپ نے بہت دُور کی سوچی پروفیسر صاحب۔ معلوم ہوتا ہے۔ اب آپ کا ذہن کچھ کچھ جاسوسی ہوتا جا رہا ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”اب اتنے بہت سے جاسوسوں میں گھر جانے کے بعد کچھ تو اثر ہونا ہی تھا۔“ وہ مسکرائے۔

”خیر۔ کنٹرول روم کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہاں فوجی موجود ہوں گے۔“ خان رحمان بولے۔

”کیوں خان رحمان۔ کیا فوجیوں کو چمک نہیں دیا جا سکتا؟“

”بالکل دیا جا سکتا ہے۔ واقعی۔ کئی آوازیں ابھریں۔“

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔“ ایسے میں فرزاد کی آواز گونجی۔

”چلو شکر ہے۔ تمہارا ذہن بھی چل نکلا۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

”اور ترکیب یہ ہے کہ ہم میں سے ایک ساتھی کو وائر لیس سیٹ دے کر کنٹرول روم میں بٹھا دیا جائے۔ اس کی نظریں سپلائی لائن پر رہیں۔ اور وہ ہمیں ہر نصیب گھنٹے بعد خیریت کی اطلاع دیتا رہے۔ اس طرح اگر گڑبڑ ہوئی تو ہمیں خیریت کی اطلاع نہیں مل سکے گی۔ اور ہم وہاں پہنچ

جائیں گے۔ ورنہ اپنا کام کرتے رہیں گے، اگر ہم نے یہ انتظام نہ کیا تو ہمیں ہر وقت کنٹرول روم کا دھڑکا لگا رہے گا۔“

”فرزاد کی ترکیب نیر ایک ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا نے شوخ لہجے میں کہا۔

”نمبر دو تو اس نے کبھی بتائی ہی نہیں۔“ فاروق نے جمل کر کہا۔

”لیکن یہاں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کنٹرول روم میں بیٹھے لگا کون؟“

”قرعہ اندازی کر لیں۔“ شوکی نے فوراً کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ یہ کام میرے لائق ہے۔ اور میں ہی بیٹھوں گا۔“ پروفیسر داؤد بولے۔

”اوہ۔ بہت بہت شکریہ پروفیسر صاحب۔ آپ نے تو ہماری

بہت بڑی الجھن دُور کر دی۔“ خان رحمان مسکرائے۔

اس ترکیب پر عمل کرنے کے بعد وہ کھلے میدان میں نکل آئے،

اب پروفیسر داؤد ان کے درمیان نہیں تھے۔

”یہاں ہماری بات چیت سننے والا کوئی نہیں۔ ہمیں اب

کیا کرنا ہے۔ ہم یہاں بے فکر ہو کر غور کر سکتے ہیں۔

کیوں کہ یہاں آس پاس کوئی چٹان۔ کوئی ٹیلہ یا کوئی درخت بھی نہیں جس کی اوٹ کوئی لے سکے گا۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”ہمارے پاس چند غداروں کے نام ہیں۔ وہ غائب ہیں۔  
 اگر ہم انہیں تلاش کر لیں۔ تو بھی شاید ان سے کوئی فائدہ  
 نہیں اٹھا سکیں گے۔ اس لیے کہ چیتے سے ہی ہم نے کیا  
 فائدہ اٹھا لیا ہے۔ ان کا باس ان کے سامنے واقعی  
 نہیں آیا ہوگا، کیوں کہ وہ کوئی بے وقوف آدمی نہیں  
 ہے۔ اب تک اس نے ہمارے ساتھ جو کیا ہے۔ اس سے  
 اس کا حد درجے چالاک ہونا ثابت ہے۔ آپ کا کیا خیال  
 ہے؟ یہاں تک کہ کرائسٹل کامران مرزا خاموش ہو گئے۔  
 ”بالکل ٹھیک۔ ہم پوری طرح اتفاق کرتے ہیں۔ سوال یہ  
 ہے کہ ہم کیا کریں۔ اسے کہاں تلاش کریں۔ سوائے ان  
 غداروں کے ہمارے سامنے تو کوئی بھی راستہ نہیں ہے۔ انکسٹر  
 جمشید نے اپنی رائے دی۔  
 ”تو پھر بسم اللہ کیجیے۔ کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پیر ہلانا ہی ہوں  
 گے۔ انکسٹر کامران مرزا مسکرائے۔  
 ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ فاروق نے فوراً کہا۔  
 ”تم نے بسم اللہ کس سلسلے میں پڑھی؟ آفتاب نے اسے گھورا۔  
 ”منا نہیں۔ انکل نے کیا کہا ہے۔ فاروق اس پر الٹ  
 پڑا۔  
 ”ابھی آپس میں لڑائی نہ شروع کرنا۔ انکسٹر جمشید نے مشورہ

دینے کے انداز میں کہا۔  
 ”بہت بہتر! جب آپ اجازت دیں گے، شروع کر لیں گے،  
 کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔“ فاروق مسکرایا۔  
 ”اور میں کہتا ہوں۔ شروع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔  
 اشفاق نے جل کر کہا۔  
 ”پہلے غدار کا نام خاور بھورا ہے۔ ہم پہلے اسے چیک کریں  
 گے۔“

انہوں نے ایک مزدور کو ساتھ لیا اور اس کی رہنمائی میں  
 خاور بھورا کے گھر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ محمود نے آگے  
 بڑھ کر دستک دی۔ جلد ہی ایک عورت کی آواز دروازے کے  
 پیچھے سے سنائی دی:  
 ”جی۔ فرمائیے۔“

”ہمیں مسٹر خاور سے ملنا ہے۔“  
 ”اس کا کل سے کوئی پتا نہیں۔ رات بھی وہ گھر نہیں  
 آیا۔“

”اوہ۔“ وہ ایک ساتھ بولے۔ ساتھ ہی انہوں نے سوالیہ  
 انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔  
 ”وہ کچھ دنوں سے بڑی بڑی رقمیں گھر میں تو نہیں لا  
 رہے تھے؟“

”وہ کیا بڑی رقمیں گھر میں لائے گا۔ چھوٹی تو لائیں سکتا، اس کو دراصل جوئے کی عادت ہے۔ اگر کہیں سے کوئی بڑی رقم اس کے ہاتھ لگ بھی گئی ہوگی تو جوئے میں ہار دی ہو گی۔“

”ہم آپ کے گھر کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”اعتراض صرف یہ ہے کہ میں ایک پردہ دار عورت ہوں، اگرچہ میرے شوہر نے کئی مرتبہ مجھے پردہ ختم کرنے کا حکم دیا، لیکن میں نے اس کے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو اہمیت دی۔ اور پردہ ختم نہیں کیا۔“ آپ کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔ اور دوسروں کے لیے ایک مثال۔ آپ بس ایک طرف ہو جائیں۔ ہم خود ہی مکان دیکھ لیں گے، فکر نہ کریں۔ آپ کی کوئی چیز ادھر ادھر نہیں ہو گی۔“

”ادھ۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں ساتھ والے گھر میں چلی جاتی ہوں۔ آپ تلاشی لے لیں۔“

بہت بہت شکریہ۔“

اور پھر انھوں نے مکان کی تلاشی لی۔ انھیں غادر جھوڑا کی ایک بڑی سی تصویر اندر سے مل گئی۔ اور کوئی کام

کی چیز نہ مل سکی۔ تصویر لیے وہ باہر آ گئے۔ اس کی بیوی کو اطلاع دی۔ تصویر اپنے پاس بطور امانت رکھنے کی اجازت مانگی اور آگے بڑھے۔

”ہمارے پاس سات خُداؤں کے نام اور ہیں۔ اگر ہم سب ایک ایک کے گھر باری باری گئے تو بہت وقت ضائع ہو گا۔ لہذا ہم دو دو کر کے ایک ایک گھر کو چیک کر لیتے ہیں۔ اور آدھ گھنٹے بعد واپس اس میدان میں جمع ہوں گے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے تجویز پیش کی۔“

”بالکل ٹھیک۔“ خان رحمان خوش ہو کر بولے۔ وہ اس قسم کے کاموں سے بہت گہراتے تھے، لیکن سراغ رسانی کے کاموں میں اس قسم کے کاموں کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔ آدھ گھنٹے بعد سب اس میدان میں پہنچ گئے۔ اسی وقت پروفیسر داؤد کی طرف سے وائرلیس پر اشارہ موصول ہوا:

”ہاں پروفیسر صاحب۔ سب خیریت ہے نا؟“

”ہاں بھئی۔ یہاں تو دُور دُور تک کسی خطرے کا نام و نشان نہیں۔ اب میں سوچ رہا ہوں۔ کیا بورڈیوٹی سنبھال لی میں نے۔“

”بس ایک رات کی تو بات ہے پروفیسر صاحب۔ صبر کر لیں۔ وہ مسکرائے۔“



"ایک رات کی بات۔ ارے باپ رے۔ جمشید۔ تم جانتے ہو۔  
انتظار کی حالت میں رات کس قدر مشکل سے گزرتی ہے۔  
"جی ہاں! میں جانتا ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ اب تو یہ  
کام کرنا ہی ہوگا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا اور سیٹ بند کر دیا۔ وہ  
سکراتے ہوئے ان کی طرف مڑے:  
"ہاں بھئی۔ کیا رپورٹ ہے؟"

"تمام غدار غائب ہیں۔ ان کے گھروں سے کوئی خاص چیز  
نہیں ملی۔ گھر والوں کا کہنا ہے کہ رات بھی گھر نہیں آئے  
تھے۔" خان رحمان بولے۔

"اوہ۔ یہ تو کافی سنسنی خیز خبر ہے۔ اب ہمیں ٹکڑیوں میں  
بٹ کر اس پورے علاقے میں پھیل جانا چاہیے۔ ہمیں تلاش  
کرنا ہے ان غداروں کو اور بھی کوئی عجیب بات اگر معلوم ہو  
سکے تو بہت اچھی بات ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"یہ ٹکڑیوں میں بیٹنے والی ترکیب اچھی ہے۔ ہم اس وقت  
کل تیرہ آدمی ہیں۔ لہذا ساڑھے چھ ٹکڑیاں تو بن ہی سکتی  
ہیں۔" مکھن نے خوش ہو کر کہا۔

"یعنی چھ ٹکڑیاں دو دو آدمیوں کی اور ایک ٹکڑی صرف ایک  
آدمی کی۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

"ہاں! یا پھر چھ ہی بنالیں، ایک ٹکڑی میں تین آدمی ہو  
جاتے ہیں۔ وہ جلدی سے بولا۔

"بھئی اس میں بحث کرنے اور وقت ضائع کرنے کی قطعاً  
ضرورت نہیں۔ بس کام شروع کر دو۔" انسپکٹر جمشید نے بٹھا کر کہا۔  
"لیکن کیسے؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ترکیب فرحت سے پوچھیں یا فرزانہ سے؟" فادوق مسکرایا۔  
"آنکھیں بند کر کے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں۔ جس نے  
جس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بس انھیں دو کی ٹکڑی تیار ہے۔" فرزانہ  
نے فوراً کہا۔

"دیکھا۔ کتنی سنہری ترکیب بتائی ٹکڑیاں بنانے کی۔  
" لیکن بے چارے تیرہویں آدمی کے ہاتھ میں تو کچھ بھی  
نہیں آئے گا۔"

"وہ جس ٹکڑی کا چاہے، ساتھ دے سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران  
مرزا نے فوراً کہا۔

"آخر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرنے سے  
پہلے وہ ایک دوسرے سے کافی دور اور الگ الگ ہو گئے تھے،  
پھر اس حالت میں وہ آگے بڑھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ  
تھام کر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ تو دیکھا کہ انسپکٹر جمشید  
کا ہاتھ شوکی کے ہاتھ میں تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے فادوق کا

ہاتھ تھام رکھا تھا، فان رحمان نے محمود کو پکڑ رکھا تھا، آفتاب نے فرزند کو، مکھن نے فرحت کو اور آصف نے افلاق کو پکڑ رکھا تھا۔ اور اشفاق حیران پریشان کھڑا تھا، اس نے گھبرا کر کہا:

”مم۔ مم۔ میں۔ میں کیا کروں؟“

”جس کے ساتھ چاہو۔ مل جاؤ۔“

”ایسے نہیں۔ میں آنکھیں بند کر کے ہی کسی پارٹی میں شریک ہوں گا۔“ اشفاق نے منہ بنایا۔

”اجازت ہے جی، اجازت ہے۔“ انیکٹر جمشید مسکرائے۔

اشفاق نے آنکھیں بند کیں۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اندھوں کی طرح آگے بڑھا۔ باقی اسے دیکھ رہے تھے۔ سامنے والے ادھر ادھر بیٹے چلے گئے۔ ابانک اشفاق کے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ آ گیا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں، اس نے انیکٹر جمشید کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا:

”گروپ تو گئے بن۔ اب ہم اسی وقت کام شروع کر رہے ہیں۔ ہر گروپ مختلف سمت میں جائے گا۔ کچھ ذکیر معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہم ٹیک ایک گھنٹے بعد پھر اس جگہ جمع ہوں گے۔ اور ایک دوسرے کی کارروائی سنیں گے۔ آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ یہاں تک کہ کر انیکٹر کاملان

مرزا خاموش ہو گئے۔

”اعتراض کی یہاں کیا گنجائش۔“ محمود نے فوراً کہا۔

”تو پھر بسم اللہ کریں۔“

انہوں نے قدم اٹھائے ہی تھے کہ انیکٹر جمشید چونک اٹھے، ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

”ذرا ٹھہریں جی۔“

وائر لیس سیٹ پر اشارہ موصول ہوا تھا۔ وہ فوراً سیٹ پر جھک گئے۔ انہوں نے سنا، پروفیسر دادر کہہ رہے تھے:

”ہیلو جمشید۔ مم۔ میں خطرے۔“

اور ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ ساتھ ہی انیکٹر جمشید چلا اٹھے:

”کنٹرول روم کی طرف۔ سب دوڑ چلیں۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ بے تحاشہ دوڑ پڑے۔

## پہلے گھما دو

وہ سر پر پاؤں رکھے دوڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ کنٹرول روم کے نزدیک پہنچ گئے۔ باہر فوجی نگران چوکس کھڑے تھے، ان کے چہروں پر کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے، انہیں اس طرح دوڑتے دیکھ کر ضرور وہ حیران ہوئے اور جلدی جلدی پٹلیں چمکائیں، پھر ایک نے آگے بڑھ کر کہا:

”خیر تو ہے۔ آپ لوگوں کو کیا ہوا؟“  
 ”اندر۔ اندر کوئی گڑ بڑ تو نہیں۔“

”گڑ بڑ۔ بھلا اندر گڑ بڑ کیسے ہو سکتی ہے۔ جب کہ ہم یہاں صحیح سلامت کھڑے ہیں۔ اندر گڑ بڑ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہمیں یہاں سے ہٹایا جائے۔“

”ہمیں! واقعی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں ضرور غلط اطلاع ملی ہو گی۔ خیر۔ اب آگئے ہیں تو پروفیسر داؤد صاحب

سے ہی ملتے چلیں۔ انہوں نے سرسری انداز میں کہا۔  
 ”ضرور جناب۔ کیوں نہیں۔“ ایک نے کہا اور انہیں اندر جانے کا رस्ता دے دیا۔

وہ سیدھے اس جگہ پہنچے۔ جہاں سے سارے ملک کو گیس سپلائی کی جاتی تھی۔ اور جس کو بند کر دیا گیا تھا۔ پروفیسر داؤد اس جگہ انہیں مل سکتے تھے، لیکن انہیں پروفیسر وہاں نظر نہیں آئے۔ اندر ماہرین ضرور موجود تھے؛  
 ”یہاں۔ پروفیسر داؤد تھے۔ کہاں گئے؟“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”بتا کر نہیں گئے۔ اندر ہی گھومنے کے لیے نکل گئے ہوں گے۔ یہاں انہیں کوئی کام تو تھا نہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”اوہ اچھا۔ محمود۔ آصف۔ فاروق۔ آفتاب۔ بھئی تم چاروں ذرا ادھر ادھر دیکھ آؤ انہیں۔ جہاں بھی ہوں، ادھر ہی لے آنا۔“ انپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

”جی ہمت۔ لیکن آبا جان۔ اس طرح تو وہ گروپ ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔ جو ہم نے ابھی ابھی بنائے ہیں۔“

”تم جاؤ۔“ انہوں نے سرد آواز میں کہا۔

چاروں کانپ اٹھے۔ بنظر اس جھلے میں کوئی خاص سختی



نہیں تھی۔ ان کے چہرے پر بھی سختی کے آثار نہیں تھے۔  
لیکن وہ ان کے اس لمحے سے اچھی طرح واقف تھے؛ چنانچہ  
وہ فوراً دہاں سے چل دیے۔

اب وہ میٹروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوسرے ہی  
لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سوتیاں تیزی سے  
نیچے گر رہی تھیں :

"ہائیں۔ یہ کیا۔ یہ تو گیس پھر غائب ہو رہی ہے۔  
ارے اسے کس نے چالو کرایا؟" وہ چلائے، پھر بے تماشہ  
لوہے کے اس پیسے کی طرف دوڑ پڑے۔ جوں ہی ان  
کے ہاتھ پیسے کی طرف بڑھے۔ ایک تیز آواز ان کے کانوں  
سے ٹکرائی :

"خبردار انپکٹر۔ اپنے ہاتھ اس پر سے ہٹا لو۔ اب تم تمام  
گیس کو ختم ہونے سے نہیں بچا سکتے۔"  
وہ سب بولکھلا کر مڑے۔ ان کی طرف کتنی ہی رائفلیں  
اٹھی ہوئی تھیں۔

"ہاتھ اوپر اٹھا دو دوستو۔"

"تت۔ تو۔ تم لوگ بھی غداروں کے ساتھ مل گئے۔"  
"تم کچھ بولو گے نہیں۔ صرف ہاتھ اوپر اٹھاؤ گے۔ سنا تم نے۔"  
ان میں سے جو سب سے لمبا تھا۔ غرایا۔

"اور تم بھی سن لو۔ ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔  
لیکن گیس کے ذخائر کو ضرور بچائیں گے۔ انپکٹر کامران مرزا نے  
بلند آواز میں کہا۔ ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔  
"تم لوگ احمق ہو۔ جو اپنی جان دینے پر تیل گئے ہو،  
لیکن ہمیں بھی تو تمہاری جانوں کی کچھ پروا نہیں۔ لہذا ہمیں  
کیا پڑی ہے۔ تمہارا لحاظ کرنے کی۔ اب جوں ہی تم حرکت  
کرو گے، ہم فائرنگ کر دیں گے۔"

"ہم اور حرکت نہ کریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو پیدا  
ہی حرکت کرنے کے لیے ہوئے ہیں۔ فرزا دمسکرائی۔

"خبردار۔ میں کڑچکا ہوں۔ خاموش رہو۔ ارے ہاں۔ وہ  
چار لڑکے۔ جو پروفیسر داؤد کی تلاش میں گئے ہیں۔ فوراً انھیں  
بھی یہاں لا کر کھڑا کر دو۔ جلدی کرو۔"

ان میں سے چار پانچ اس سمت میں دوڑ گئے۔ جس  
طرف وہ چاروں گئے تھے۔ ان پر یہ وقت عجیب تھا۔ ہر  
لمحے بے تماشہ مقدار میں گیس ضائع ہو رہی تھی۔ ڈیڑھ سو  
سال کی ضروریات کے برابر گیس پہلے ہی ضائع ہو چکی تھی۔

اور اب گویا اس کا دوسرا راؤنڈ شروع کر دیا گیا تھا۔  
ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح پیسے کو واپس  
گھمائیں۔ رائفلوں والے بالکل چوکس کھڑے تھے۔ اور ہر

ایک کی طرف ایک ایک راتفل تھی تھی۔ تعداد میں وہ لوگ ان سے کہیں زیادہ تھے۔ ایسے میں وہ کرتے بھی تو کیا۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے؛  
 "آخر اس گیس کو ختم کر کے تم لوگوں کو کیا مل جائے گا۔" خان رحمان غراتے۔  
 "بہت کچھ۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔" لمبا آدمی مسکرا کر بولا۔

"تم لوگ بہت بڑے غدار ہو۔ اور غداری کی سزا موت ہے۔ صرف موت۔"  
 "ہمیں سزا دے گا کون۔ تم لوگ تو اب زندہ رہو گے نہیں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ ہمیں ختم کیوں نہیں کر دیتے۔" انپیکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"باس کی اجازت کے بغیر ہم آپ لوگوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ ان کی ہدایت یہی ہیں۔ ہاں اگر جان پر رہن جائے تو پھر ہمیں ضرور فائرنگ کرنے کا حکم ہے۔" باس کا کہنا ہے، پہلے وہ آپ سے چند باتیں کریں گے، اس کے بعد موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہم تمہاری جان پر بنا کر رہیں

گے۔" انپیکٹر جمشید مسکراتے۔

میں اُسی وقت کوئی چیز دم سے سب کے درمیان میں گری، لمبا آدمی اور اس کے تمام ساتھی چونک گئے۔ اور یہ چونکا انپیکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں کو کام دے گیا۔ انھوں نے بلا کی رفتار سے ان پر چھلانگیں لگا دیں۔ وہ راتفلوں سمیت گرنے اور ان کے نیچے دب گئے۔ اب راتفلوں کے لیے جنگ ہو رہی تھی۔ ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ راتفل چھین لیں۔ دم سے گرنے والی چیز لوہے کا ایک پائپ تھا۔ جو ان سب کے درمیان میں گرا تھا۔ انھیں یہ دیکھنے کی مہلت نہیں ملی تھی کہ لوہے کا پائپ کس نے پھینکا ہے۔ وہ تو بس دشمنوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ایسے میں سب کے سب دشمن بڑی طرح بوکھلا گئے تھے، کیوں کہ کہاں تو وہ ان سب کو راتفلوں کی زد پر لیے کھڑے تھے۔ کہاں اب ان راتفلوں کے لیے کوشش ہو رہی تھی۔ اور یہ کوشش زندگی اور موت کی کوشش تھی، لیکن دشمنوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اور ان لوگوں نے ایک وقت میں ایک ایک آدمی پر چھلانگ لگائی تھی۔ اس لیے۔ دشمنوں کے کچھ ساتھی بچ گئے تھے۔ اور ان کے پاس راتفلیں بھی تھیں۔ لہذا وہ اس کوشش میں تھے کہ جوں ہی ان میں سے کوئی ان کی زد پر آئے۔ وہ



فار کر دیں، لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ وہ کبھی اوپر ہو رہے تھے۔ تو کبھی نیچے۔ ان حالات میں نشاء لینا بہت مشکل تھا۔ گولیاں ان کے اپنے ساتھیوں کو بھی لگ سکتی تھیں۔ لہذا وہ خبردار۔ خبردار۔ گولی مار دیں گے۔ ان لوگوں کو چھوڑ دو۔ کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ وہ بھلا ان گیدڑ جھبکیوں میں آنے والے کب تھے۔ ایسے میں ان لوگوں کے سروں سے وزنی چیزیں آ کر ٹکرائیں۔ جو رائفلیں تانے آوازیں نکال رہے تھے۔ اور دھم دھم کر کے اندھ سے منہ کرے۔ ایک دو جو چوٹ لگنے سے محفوظ رہے۔ بلا کی رفتار سے مڑے، لیکن اپنے پیچھے تو انہیں صحت ستون نظر آئے۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ ان کے دشمن ستونوں کے پیچھے ہیں۔ لہذا وہ اندھا دھند ستونوں کی طرف دوڑ پڑے۔ ساتھ ہی چند فائر ہوتے آواز ان کی لاشیں تڑپنے لگیں۔

"اب مقابلہ برابر کا سمجھو آفتاب کی آواز سنائی دی۔"

ساتھ ہی وہ چاروں ستونوں کے پیچھے سے نکل آئے اور لڑنے والوں کی طرف پکے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی اب آواز داد مدد کر سکتے تھے۔ انھوں نے مرنے والوں کی رائفلیں اٹھا لیں اور انہیں نالوں کی طرف سے پکڑ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ جس دشمن کا سر بھی ان کی زد پر آیا۔ وہ اسے بٹوں کا نشاء

بناتے چلے گئے۔ چند منٹ میں ہی میدان صاف تھا۔

"یہ کارنامہ محمود، فاروق، آفتاب اور آصف کا کارنامہ تھا۔"

خان رحمان لپکتے ہوئے بولے۔

"ارے! ہم ان کو تو بھول ہی گئے۔ جو ہمارے ان چار ساتھیوں کی تلاش میں گئے تھے۔"

"ان کی واپسی کا انتظار کرو۔ رائفلیں تان لو۔ پہلے میں اس پیسے کو گھما دوں۔"

یہ کہہ کر ان پکڑ جمشید نے آگے لپک کر پیسہ گھما دیا۔

سوئیاں نیچے گرنا بند ہو گئیں۔

"آف مالک۔ یہ لوگ تو بس گیس ضائع کرنے پر متل گئے ہیں۔"

"شاید۔ اس کے بغیر ان کی روٹی ہضم نہیں ہوئی۔ فاروق نے منہ بنایا۔"

"ہم یہ رات کنٹرول روم میں گزاریں گے۔ رات کے وقت یہاں سے ہٹنا خطرناک ہوگا۔ نہ جانے، مارے چالاک دشمن نے کتنے لوگوں کو فدا کر پر آمادہ کر لیا ہے۔"

"اور۔ پروفیسر انکل کہاں ہیں۔ فرحت نے پریشان ہو کر کہا۔"

"وہ ہمارے قبضے میں ہیں۔ انھوں نے کسی کو طنز انداز



میں کہتے سنا۔

وہ دھک سے رو گئے۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک ستون کے پیچھے سے پروفیسر داؤد کا صرف چہرہ دکھائی دیا۔ ان کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

”یہ پوری طرح ہمارے قبضے میں ہیں۔ دو راتوں کی نالیں ان کی دونوں کن پٹیوں پر رکھی ہیں۔ اگر ان کی زندگی چاہتے ہو تو پیسہ اٹا گھما دو۔ ورنہ ہم انہیں گولی مار دیں گے۔“

ان کی مٹی گم ہو گئی۔ سب نے جلدی جلدی ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کڑ رہے ہوں:

”اب کیا کریں؟“

”سوچ کیا رہے ہو۔ تم لوگوں کے لیے اب صرف ایک ہی راستا ہے۔ یہ کہ پیسہ اٹا گھما دو۔ جب گیس کا ذخیرہ دم توڑ دے گا تو ہم پروفیسر صاحب کو چھوڑ دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ کہ ان کے جسم پر خراش تک نہیں آئے گی۔ لیکن اگر ہمدانی ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو پھر ان کی لاش یہاں پڑی تڑپ رہی ہوگی۔“

وہ سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔

”کیا سوچ رہے ہو۔ ہم زیادہ مہلت نہیں دے سکتے۔“

ہم گولی مارنے لگے ہیں:

”ٹھٹھ۔ ٹھرو۔ انپکٹر جمشید بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

”کیا کرنے لگے ہو جمشید۔ خبردار۔ پیسہ اٹا نہ گھمانا۔ مجھے شہید ہو جانے دو۔ پروفیسر داؤد کی آواز گونجی۔

”آپ۔ آپ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے پروفیسر صاحب۔ انپکٹر جمشید نے لڑکھڑائی آواز میں کہا۔

”کیا کیسے ہو سکتا ہے۔ میری زندگی کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ مجھے مر جانے دو۔ گیس کا ذخیرہ بچا لو۔ یہ مسئلہ من ڈیڑھ سو سال کے لیے ملکی ضروریات پوری ہونے کا ہی نہیں ہے۔ کچھ اور بھی ہو گا۔“

”ہاں پروفیسر صاحب۔ یہ لوگ کوئی وقتی فائدہ بھی اٹھا کے چکر میں ہیں، لیکن اس کے باوجود۔ آپ کی زندگی بھی ملک کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ وہ بولے۔

”میں اتنا اہم نہیں جمشید۔ مجھے جیسے یہاں دو تین آدمی اور ہیں۔ میں نہیں ہوں گا تو ملک کے لیے وہ مجھ جیسا کام کرتے رہیں گے، لہذا پیسہ اٹا نہ گھمانا۔ ورنہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔ میں تم سے زندگی بھر نہیں بولوں گا۔ ان کی آواز جذبات تلے دب گئی۔

انپکٹر جمشید نے بے چارگی کے عالم میں انپکٹر کامران

مرزا کی طرف دیکھا :

"م۔ میں کیا کروں دوست؟

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" انپکٹر کامران مرزا نے پریشان ہو کر دیکھا۔

"اس میں کچھ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے کامران مرزا۔ میں کہ چکا ہوں۔ میری پرواز کی جائے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"کیسے پرواز کریں انگل۔ آپ کے بغیر۔ ہم بالکل ناکارہ ہو کر رہ جائیں گے۔"

"غلط۔ بالکل غلط۔ دنیا کے کام کبھی نہیں رکتے۔ اللہ تعالیٰ ایک سے بڑھ کر ایک پیدا کر دیتے ہیں۔ خبردار۔ گیس کے ذخائر کو بچانا بہت ضروری ہے۔"

"اچھا تو پھر۔ ہم گولی چلا رہے ہیں۔ ستون کے پیچھے سے خوف ناک انداز میں کہا گیا۔

"ن۔ نہیں۔" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ٹھہرو بھئی۔ میں پیسہ گھا رہا ہوں۔" انپکٹر جمشید چلائے۔

"م۔ میں۔ جمشید میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"م۔ میں کیا کروں پروفیسر صاحب۔ میں مجبور ہوں۔"

"کہہ کر انہوں نے پیسے پر ہاتھ جما دیے۔ ان سب

کی نظریں ستون پر جمی تھیں۔ دشمن ان کے سامنے نہیں تھا، ورنہ وہ اس موقع پر ضرور کچھ نہ کچھ کر گزرتے۔

انپکٹر جمشید کے ہاتھ پیسے پر سرکنے لگے۔ پروفیسر داؤد دکھ بھرے انداز میں بولے :

"ن۔ نہیں۔ نہیں۔ جمشید نہیں۔ یہ۔ یہ تم کیا کر رہے ہو جمشید۔ تم نے آج میرا بھی کنا نہیں مانا۔ تم ایسے تو نہیں تھے۔ ان کی آواز غم کے بوجھ تلے دب گئی۔ انپکٹر جمشید پیسے پر زور لگاتے رہے۔ پھر ہاتھ روک کر انہوں نے کہا :

"اب تم لوگ انہیں چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دیں۔ ہمیں نہیں معلوم۔ تم نے پیسہ گھمایا ہے یا نہیں۔"

"تب پھر تم میں سے ایک آ کر دیکھ لے۔"

"ہاں ! یہ ٹھیک رہے گا۔" آواز سنائی دی۔

پھر ایک دشمن ستون کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا اور آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں میں راقفل تھی اور وہ حد درجے محتاط نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ میٹروں کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ اس نے نظریں جوں ہی میٹروں پر جمائیں۔ انپکٹر کامران مرزا نے اس پر ایک

اس ہلاک لگائی اور اسے ساتھ لیتے نیچے گرنے۔ اس کی  
 راتسل نیچے گری اور دور تک پھلتی چلی گئی۔ اگر محمود  
 ہلاک بڑھا کر روک نہ دیتا تو نہ جانے کہاں جا کر رہتی۔  
 دوسرے ہی لمحے اس نے راتسل اٹھالی اور گرنے والے  
 کی کن پٹی پر اس کی نال دکھ دی :  
 "لیٹے رہو پیارے دشمن۔ اگر اس طرف پروفیسر داؤد  
 پر گولی چلی۔ تو اس طرف تمہارے سر میں گولیاں تیر  
 جائیں گی۔ کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے، اس  
 ہاتھ لے۔"  
 "اوہ؟ دشمنوں کے منہ سے نکلا۔"

"م۔ مجھے بچا لو استاد۔ یہ۔ یہ لوگ ذرا لحاظ نہیں کریں  
 گے۔ نیچے لیٹا ہوا دشمن لرز کر بولا۔  
 "کتنا فرق ہے۔ ہمارے ساتھی میں اور دشمن کے ساتھی  
 میں۔ ہمارے ساتھی ملک کے لیے جان دینے کے لیے  
 پوری طرح تیار ہیں۔ جب کہ ان کا ساتھی اپنی زندگی  
 کی بھیک مانگ رہا ہے۔" خان رحمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔  
 دشمن کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ سوچ  
 میں تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جس آنجن سے انھوں نے ان  
 لوگوں کو دو چار کر دیا تھا۔ اب وہی آنجن ان کا مقدر بن

گئی تھی۔ آخر ستون کی طرف سے آواز آئی۔

"ہم تو پہلے ہی اپنے بے شمار آدمی ہلاک کر چکے ہیں۔ ایک  
 یہ بھی سہی۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔  
 "یہ۔ یہ تم کیا کر رہے ہو استاد؟ وہ چیخا۔

"ہاں بھئی۔ کیا کیا جائے۔ ہمارے لیے اس وقت سب سے  
 اہم کام گیس کا ذخیرہ ختم کرنا ہے۔ اپنے کسی ساتھی کی جان  
 بچانا نہیں۔"

"گویا تم لوگ تبادلہ کرنے پر تیار نہیں ہو؟  
 "بالکل نہیں۔ اس کو بے شک گولی مار دو۔ ہم پروفیسر  
 داؤد کو پھر بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے بدلے میں تو  
 تم لوگوں کو گیس کا ذخیرہ خالی کرنا ہوگا۔ اس نے شوخ  
 آواز میں کہا۔

انپکٹر جمشید جھنڈا آٹھے۔ ان کا یہ وار خالی گیا تھا۔  
 انھوں نے تو دراصل پیہ گھومایا ہی نہیں تھا۔ ظاہر یہ کیا  
 تھا کہ جیسے پیہ گھما رہے ہوں۔  
 "اب۔ اب تو پیہ سچ پچ گھمانا ہی پڑے گا۔"  
 "کیوں گھمانا پڑے گا۔ جمشید۔ میں جو کہ چکا ہوں۔  
 مت گھماؤ۔ میں مرتا ہوں تو مر جانے دو۔ پروفیسر داؤد کی  
 آواز ان کے کانوں میں آئی۔



"ہمارے لیے۔ آپ بھی کم اہم نہیں۔ اور گیس بھی۔ ہمیں تو دونوں کو بچانا ہے۔ ہم ایک بھی کیوں ضائع کریں؟" انپکٹر کامران مرزا نے جلدی جلدی کہا۔

"کیوں! جب پیہ گھما دو گے۔ تو کیا گیس کو ضائع نہیں کرو گے؟" پروفیسر داؤد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"گیس یک دم تو خارج ہو نہیں جائے گی۔" انھوں نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ آہستہ آہستہ ہو جائے گی۔ یہ لوگ ہمیں کب مہلت دینے لگے۔" پروفیسر بولے۔

"یہ جیلے بازی ختم کرو۔ اور فیصلہ کرو۔ اگر پیہ اٹا گھمانا ہے تو پھر ایک سیکنڈ کی دیر کیے بغیر گھما دو، ورنہ ہم پروفیسر کو گولی مارتے ہیں۔"

"یاد رکھو۔ ادھر تم گولی مارو گے۔ ادھر تمہارے آدمی کو گولی مار دی جائے گی۔" خان رحمان غراتے۔

"ہمیں اس کی پروا نہیں۔"

"تم نے سن لیا۔ تمہارے ساتھیوں کو تمہاری کوئی پروا نہیں۔" انپکٹر جمشید نیچے لیٹے دشمن سے بولے۔

"ہاں! سن چکا ہوں۔ کاش میں نے ان کا ساتھ نہ دیا ہوتا۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم توبہ کر لو۔ ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ جان بھی بچ جائے گی اور مقدمے بازی سے بھی بچ جاؤ گے۔ بس قانون کی مدد کرو۔"

"مم۔ میں تیار ہوں۔"

"کیا!! ستون کے پیچھے سے چمخ کر کہا گیا۔ ساتھ ہی ایک فائر ہوا۔"

## دھماکے

کنٹرول روم میں دھماکے کی آواز کیا گونجی کہ دوڑتے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔ شاید باہر موجود فوجی اندر آ رہے تھے۔ انہوں نے سوچا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اب پروفیسر صاحب کی جان بچ گئی۔ اور گیس بھی بچ گئی، لیکن اسی وقت ایک اور آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، آواز ستون کے دوسری طرف سے ابھری تھی:

”خبردار۔ اندر آنے والے ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔ ورنہ۔ ورنہ پروفیسر داؤد کو گولی مار دی جائے گی۔“

اندر داخل ہونے والے فوجی ٹھٹک کر رک گئی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان سب کی طرف دیکھا۔ اور پھر ایک کے منہ سے بوکھلائے ہوئے انداز میں نکلا:

”لگ۔ کیا۔ کیا مطلب؟“

”مطلب کا معاملہ ذرا گڑ بڑ ہے جناب۔ اندر اچھی سہیل گڑ بڑ

پہنچی ہوئی تھی اور آپ کو معلوم ہی نہیں تھا۔“

”اوہ۔ ان کے منہ سے نکلا۔“

”اور اگر یہ فائر نہ ہوتا تو شاید اب بھی آپ لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔“ آفتاب بولا۔

”ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دراصل ہمیں کنٹرول روم کے باہر مقرر کیا گیا تھا۔ اندر کے معاملات تو ہمیں سونپے ہی نہیں گئے تھے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ مکھن بے چارگی کے عالم میں بولا۔

”اور۔ یہ لاش کس کی تڑپ رہی ہے؟“

”انہی لوگوں کے ایک ساتھی کی۔ پروفیسر داؤد ان کے قبضے میں ہیں۔ اور ان کے زور پر یہ گیس کا ذخیرہ ضائع کرا دینے پر تیلے ہوئے ہیں۔ آپ لوگ بھی اندھا دھند اندر آ گئے۔ حالاں کہ آپ کو چاہیے تھا۔ بہت احتیاط سے اندر داخل ہوتے۔“

”واقعی ہم سے بہت غلطی ہوئی، لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے۔“ فوجیوں کے انچارج نے کہا۔

”بالکل ٹھیک۔ آپ لوگ اب کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

لہذا آپ بھی ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔ ایک تو آپ لوگ ہماری زد پر ہیں۔ دوسرے پروفیسر داؤد ہمارے قبضے میں ہیں،

لہذا ہوگا وہی جو ہم چاہیں گے۔

”اُٹ۔ اب ہم کیا کریں؟“ فوجی نے کہا۔

”کرنا کیا ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھا دیں آپ لوگ بھی۔ شوکی نے جل کر کہا۔

”مشورہ نیک ہے۔ ستون کی طرف سے آواز سنائی دی۔

اور پھر فوجیوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

”میدان گویا مکمل طور پر ہمارے ہاتھ میں ہے۔“ استاد نے چمک کر کہا۔

”ہاں استاد۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ کمال تو باس کا ہے۔ اس نے ہمیں پہلے ہی ہر طرح کی ہدایات دے دی تھیں۔“

”باس۔ لیکن بھی۔ تم لوگوں کا باس ہے کہاں؟“ انپیکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

”اور باس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم لوگ بہت چالاک ہو، وقت گزارتے رہنے کی حکمت عملی پر عمل کرو گے۔ لہذا باس کی یہ بات بھی بالکل سچ ثابت ہوئی۔ دیکھ لو۔ تم وقت گزار رہے ہو۔ لیکن ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ اگر نصف منٹ کے اندر۔ یعنی تیس سیکنڈ کے اندر پہیہ بالکل نہ گھوم گیا۔ تو پروفیسر داؤد دوسری دنیا کی طرف گھوم جائیں گے۔“

”پروا نہیں۔“ پروفیسر داؤد بلند آواز میں بولے۔

”آپ کو نہ ہوگی پروا۔ آپ کے ساتھیوں کو تو ہے۔“

صرف تیس سیکنڈ۔ اس بار لہجے میں دھمکی تھی۔

انہوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر

انپیکٹر کامران مرزا بولے:

”انپیکٹر جمشید۔ اب تو پہیہ گھمانا پڑے گا۔“

”ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ وہ بولے۔

”لیکن انپیکٹر جمشید۔ جھوٹ موٹ کا نہ گھمانا۔ پہلے کی طرح،

ورنہ ہم ایک ساتھ سب کو بھون دیں گے۔“

”نہیں۔ اس بار پہیہ واقعی گھومے گا۔ ہم پروفیسر صاحب کو ہر قیمت پر بچائیں گے۔“

”تم احمق ہو جمشید۔“ پروفیسر داؤد غڑائے۔

”میں احمق ہی بھلا۔“ انپیکٹر جمشید نے عجیب انداز میں کہا۔

اور پیسے کی طرف مڑے۔ پھر ان کے دونوں ہاتھ پیسے

پر جم گئے۔ دل میں انہوں نے کہا:

”یا اللہ! ہماری مدد کر۔ گیس کو بچانا بھی ملک کے

لیے بہت ضروری ہے۔ اور پروفیسر صاحب کی زندگی بھی انتہائی

اہم ہے۔ اب ہم کریں تو کیا۔“

یعنی اسی وقت ایک تیز چیخ گونجی۔





اس بیچ کے ساتھ ہی انپکٹر کامران مرزا نے بے تحاشہ ستون کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ان کی ایک ہی لمبی چھلانگ انہیں ستون تک لے آئی۔ ایک لمبے میں انہوں نے دیکھ لیا کہ محمود تنہا دشمنوں سے بڑا ہوا تھا۔ اور ایک دشمن بڑی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی کمر سے خون اُبل رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ بھی آندھی اور طوفان کی طرح دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ اتنے میں باقی ساتھی بھی آپہنچے، انپکٹر جمشید نے پیسے کو چھوڑا، ادھر کا رخ کیا۔

ایک منٹ بعد کنٹرول روم میں خون ریز جنگ ہو رہی تھی۔ لیکن اس جنگ میں فوجیوں نے حصہ نہیں لیا۔ وہ حیرت کا بت بنے کھڑے رہے۔

ان پر جوش کی کچھ ایسی حالت طاری تھی کہ ہاتھ اور پیر بجلی کی طرح کوندتے نظر آ رہے تھے۔ اور پھر جس جنگ میں انپکٹر جمشید، انپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان پورے جوش میں ہوں، اس کا حال کیا ہوگا۔ پھر یہ کہ محمود وغیرہ بھی کچھ کم نہیں تھے۔ نتیجہ یہ کہ صرف تین

منٹ بعد میدان ان کے ہاتھ تھا۔ اور وہ دشمنوں کے چاروں طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ فوجی اب تک حیرت کا بت بنے ہوئے تھے۔

”آپ لوگ کنٹرول روم کا بیرونی حصہ سنبھالیں۔ یہاں کے لیے ہم کافی ہیں۔“ انپکٹر جمشید نے ان سے کہا۔

”بہت بہتر۔ ویسے یہ شان دار کامیابی مبارک ہو۔“  
”شکریہ! انہوں نے کہا۔ اور وہ باہر چلے گئے۔

”محمود۔ تم نے کمال کر دیا۔ میں تو تمہیں دیکھ کر حیران ہی رہ گیا تھا۔“ پروفیسر داؤد نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔  
”اور ہمیں بھی پتا نہیں چلا کہ یہ کب ہم سے الگ ہو کر ستون کے اس طرف آ گیا۔“ خان رحمان بولے۔

”جب باہر والے فوجی دوڑ کر اندر آئے تو اس وقت میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ خیال یہ آیا کہ دشمن ضرور اس وقت بیرونی دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا ہوگا۔ لہذا میں تیر کی طرح اس طرف آ گیا۔ جوتے کی ایڑی سے میں چاقو پیسے ہی نکال چکا تھا۔ بس میں نے دوسرے ستون کی اوٹ لے لی۔ اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جوں ہی موقع ملا۔ میں نے چاقو پھینک مارا۔ اس نے جلدی جلدی کہا۔“

"بہت خوب۔ سہرا تو پھر اس بار لے گئے تم۔ شوکی نے سکرا کر کہا۔"

"لو۔ ان حضرات کو سہروں کی پڑی ہے۔ یہاں پورا ملک داؤ پر لگا ہوا ہے۔ آصف نے منہ بنایا۔"

"ہاں واقعی۔ ویسے اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم نے یہاں پروفیسر صاحب کو مقرر کر کے غلطی کی تھی۔ یہاں تو چند بہت طاقت ور اور بڑے قسم کے لوگوں کی ضرورت تھی، اکرام اور شاہد جیسوں کی۔ انیکٹر جمشید بولے۔"

"تو انہیں اب بلا لیں۔ ابھی ہمارا یہاں کام ختم تو نہیں ہو گیا۔ کام بھی باقی ہے۔ اصل سازشی بھی۔"

"ہاں! میں اب یہی سوچ رہا ہوں۔ اب جب تک دونوں نہیں آ جاتے۔ اس وقت تک ہم کنٹرول روم کو خالی نہیں کریں گے۔ میں زبردست خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔"

انیکٹر کامران مرزا بولے۔  
"ٹھیک ہے۔ میں فون کرتا ہوں ان دونوں کو۔ انیکٹر جمشید بولے۔"

اور پھر وہ فون کرنے لگے۔ دشمنوں کا وہ ساتھی جو ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ گولی کا نشانہ بن چکا تھا اور اس کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔ گویا اس سے

بھی انہیں کوئی بات معلوم ہونے کی امید نہیں رہی تھی۔  
"تم لوگوں کا باس کہاں ہے دوستو؟ انیکٹر کامران مرزا نرم آواز میں بولے۔"

"پتا نہیں۔"

"اس کی ہدایات تھوڑی دیر پہلے تم لوگوں تک کس طرح پہنچی تھیں؟"

"وائر لیس کے ذریعے۔"

"اور وائر لیس سیٹ کہاں ہے؟"

"یہیں موجود ہے۔ ان کے استاد نے کہا۔"

"اس پر باس سے رابطہ قائم کرو۔ اور اس کو بتا دو تم لوگ چھٹس گئے ہو۔"

"جو حکم۔ کیا مجھے وائر لیس سیٹ نکالنے کی اجازت ہے؟ اس نے کہا۔"

"سیٹ کہاں ہے؟"

"میری جیب میں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"ٹھہرو دوست۔ ہم اتنے اناڑی نہیں۔ سیٹ تمہیں ہم نکال کر دیں گے۔ باقی سب لوگ ہاتھ اٹھائے کھڑے رہیں گے۔ محمود نے تیز آواز میں کہا۔"

ان کے چسکے لٹک گئے۔ محمود نے آگے بڑھ کر استاد کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا جس طرف وہ ہاتھ بڑھا رہا تھا، لیکن اس میں سیٹ کی بجائے پستول تھا:

"کیا اس کے ذریعے بات چیت کرنے کا ارادہ تھا؟ اس نے طنز پر لہجے میں کہا۔

"ہاں! ارادہ تو تھا۔ وہ مسکرایا۔

اب محمود نے دوسری جیب کو ٹٹولا، اس میں دائر لیس سیٹ موجود تھا۔ وہ آن کر کے اسے دیا گیا:

"اپنے باس کو یہاں کے حالات میں تبدیلی کی اطلاع دو۔"

"اچھا؟ اس نے جھٹکا کر کہا، پھر دائر لیس سیٹ پر فری کوئٹسی ملانے کے بعد اس نے کہا:

"ہیلو باس۔ چند سکنڈ تک وہ ہیلو باس ہیلو باس کرتا رہا، پھر آواز آئی:

"لیس شوکا۔"

شوکانے حالات کو سنائے۔ اس نے خاموش ہونے کے بعد باس کی آواز سنائی دی:

"اور تم سیٹ پر یہ حالات کس طرح سنا رہے ہو، جب کہ ان کے قبضے میں ہو؟"

"ان لوگوں نے ہی ایسا کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ خیر۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم اپنے پروگرام پر عمل ضرور جاری رکھیں گے۔ یہ لوگ اس عمل کو روک نہیں سکتے۔ میں منصوبہ بندی پہلے ہی کر چکا ہوں۔ اس بات کا خیال مجھے پہلے ہی تھا کہ کہیں یہ لوگ ہماری کوشش اس مرحلے پر ناکام نہ بنا دیں۔ لہذا بہت جلد تم دیکھو گے کہ کیا اس طرح پلٹتی ہے۔"

"شکریہ باس۔ میں اور میرے تمام ساتھی پوری طرح آپ کے ساتھ ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ دوسری طرف سے کہا گیا اور آواز بند ہو گئی۔

محمود نے بھی سیٹ اس سے لے لیا۔

"اب ہمیں پہلی فرصت میں ان لوگوں کو باندھنا ہوگا، کیوں کہ اس کے بعد ہم باس کا استقبال کرنے کی تیاری کریں گے۔ انپیکٹر کامران مرزا بولے۔

سب نے ان لوگوں کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ عین اسی وقت کنٹرول روم کے باہر ایک زبردست دھماکا ہوا، اور یہ دھماکا کسی پستول یا رائفل کی گولی کا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہ دھماکا کسی بم کا تھا۔ کنٹرول روم لرز کر رہ گیا۔ انہیں یوں لگا۔ جیسے۔ بم عین کنٹرول



دوم کے باہر گرا ہو۔ اور پھر بے شما پتھروں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سکتے ہیں آگئے۔ انہوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا:

”جمشید۔ ہمیں فوراً کنٹرول روم سے باہر نکل جانا چاہیے۔“  
”یہی تو ہمارا دشمن بھی چاہتا ہے خان رحمان۔“  
”کیا مطلب؟ وہ چونکے۔“

”یکہ۔ ہم کنٹرول روم خالی کر کے بدحواس ہو کر یہاں سے بھاگ نکلیں اور وہ پیسے کو آٹا گھما دیں۔ تاکہ گیس کا باقی ماندہ ذخیرہ ختم ہو جائے۔ ان کا اصل نمسک گیس کا ذخیرہ ہے۔“

”پتا نہیں۔ یہ لوگ ہماری گیس کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں۔ اس دشمنی سے انہیں کیا مل جائے گا۔“ فرحت بڑبڑاتی۔

”یہ بات ان کے پاس کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں شاید۔“ انیکٹر کامران مرزا بڑبڑاتے۔

”جو کچھ بھی کرنا ہے۔ فوراً کرو جمشید۔ کہیں وہ کنٹرول روم کو بھی بم سے نہ اڑا دے۔ اور چوں کہ ہم خود عمارت کے اندر موجود ہیں۔ اس لیے ہم بھی اڑ جائیں گے۔“

خان رحمان بولے۔

”چلیے اچھا ہے نکل۔ اڑنے کا شوق بھی تو بہت ہے ہمیں۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

”آئے دن جہازوں میں اڑنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے، اور پھر بھی شوق ختم نہیں ہوا ان کا۔“ اخلاق نے منہ بنا کر کہا اور وہ مسکراتے بغیر نہ رہ سکے۔

”ہوا چیونٹی کو بھی زکام۔“ فاروق نے ہنسا کر کہا۔  
”بالکل غلط۔ زکام ہوتا ہے بی مینڈکی کو۔ چیونٹی کے تو پرنیکل آیا کرتے ہیں۔“ مکھن چمکا۔

”یہ محاورے بازی کا وقت نہیں ہے۔ باہر کسی بچے نے پٹاخہ نہیں چلایا۔ بم پٹا ہے۔“ پروفیسر داؤد چلائے۔

”اوہ ہاں۔ واقعی۔ یہ بات تو ہم بھول ہی گئے۔“ اشفاق لرز کر بولا۔

”اگر بھولنے کا یہی عالم رہا۔ تو پھر تو حاصل کر لی ہم نے یہاں کامیابی۔“

”اس بے چاری کا تو دور دور تک پتا نہیں آفتاب مسکرایا۔“ لگ۔ کس بے چاری کی بات کر رہے ہو پروفیسر داؤد

بے دھیانی کے عالم میں بولے۔  
”بچ۔ کامیابی کی۔“

لیکن بھئی۔ کامیابی بے چاری کب سے ہو گئی۔ خان رحمان بولے۔

”جب سے ہم اس کنٹرول روم میں آ پہنچے ہیں۔ حد ہو گئی۔ تم لوگ تو ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہو۔“ پروفیسر نے ہنسا کر کہا۔

”خوف زدہ ہو کر ہم بموں کو پھٹنے سے نہیں روک سکتے انکل۔“ فاروق نے شریعہ آواز میں کہا۔

”سنو بھئی۔ باس صاحب ہمیں بموں کی آوازوں سے خوف زدہ کر کے باہر نکال دینا چاہتے ہیں، لیکن ہم اتنے بھولے نہیں۔“ انیکٹر جمشید بولے۔

”لیکن انکل۔ اگر اس نے کنٹرول روم پر بم پھینک مارا۔“ فرحت نے منہ بنا کر کہا۔

”اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ گیس کا ذخیرہ تباہ ہو جائے ہو سکتا ہے کہ گیس نیچے محفوظ رہ جائے۔“ انھوں نے کہا۔

”اوہو اچھا۔“ پروفیسر چونکے۔

”لہذا۔ ہم عمارت میں بالکل محفوظ ہیں۔ وہ عمارت پر

بم نہیں مارے گا۔ یہ اس کی صرف ایک چال تھی۔“

”کمال ہے۔ تم دشمن کی چالوں کو بھانپنے میں بھی جواب نہیں

رکھتے۔“ خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

”کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔ نہ بھانپیں تو وہ ہمیں کب پھوڑیں گے۔“ محمود مسکرایا۔

عین اُسی وقت ایک اور خوف ناک دھماکا ہوا۔

”دوسرا بم۔“ کئی آوازیں ابھریں۔

”نہیں بھئی۔ ہم عمارت خالی نہیں کریں گے۔ چاہے تم کچھ بھی کر لو۔“ انیکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

پانچ منٹ بعد تیسرا بم پھٹا۔ اور کیوں لگا جیسے باہر چیخ و پکار مچ گئی ہو۔ اس چیخ و پکار نے انھیں بے تاب کر دیا :

”جمشید۔ کہیں اب اس نے آبادی پر تو بم نہیں گرا دیا۔“

”اللہ اپنا رحم کرے۔ میں دشمن کو اس حد تک سنگ دل

نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے اب باہر جانا ہی ہو گا۔ آپ لوگ

یہیں ٹھہریں۔“ انیکٹر جمشید تلکلاتے ہوئے انداز میں بولے۔

”اکیلے نہ جاؤ جمشید۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

خان رحمان جلدی سے بولے۔

”اور میں بھی۔“ محمود بولا۔

”اچھا خیر۔ تم دونوں میرے ساتھ آ جاؤ، لیکن باقی لوگ

یہیں رہیں گے۔ یہاں موجودگی بہت ضروری ہے۔ دشمن

چاہتا ہے۔ کسی طرح گیس کا مکمل ذخیرہ ختم ہو جائے۔  
 ”اور ہم اپنی جانیں تو دے دیں گے۔ ذخیرہ ختم نہیں ہونے  
 دیں گے۔“ پروفیسر داؤد نے پُر جوش انداز میں کہا۔  
 ”اور میں چاہتا ہوں۔ ہم جانیں بھی بچالیں اور گیس بھی۔“  
 انپیکٹر کامران مرزا مسکراتے۔

”آمین! وہ ایک ساتھ بولے اور انپیکٹر جمشید خان رحمان اور  
 محمود کو لے کر باہر کی طرف دوڑ پڑے۔“

ابھی وہ دروازے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ کرنل راضی  
 اور چند فوجی آفیسر اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے فق تھے،  
 ”یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بموں کے دھماکے۔“ کرنل راضی  
 بولے۔

”جی ہاں کرنل صاحب۔ ہمارا دشمن چاہتا ہے۔ کسی طرح  
 ہماری گیس کے ذخائر ختم کر دے۔ ہم نے جو نصف ذخیرہ بچا  
 لیا ہے نا۔ تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔“  
 ”اوہ! اوہ! کرنل راضی نے غصے میں آکر اپنی چمڑی پنڈلی  
 پر ماری۔“

”آپ حالات اور واقعات انپیکٹر کامران مرزا سے سن لیں،  
 میں ذرا باہر کی خبر لینے جا رہا ہوں۔ ویسے آپ بھی تو بتا  
 ہی سکتے ہیں۔ ہم اس نے کہاں پھینکے ہیں؟“

”پہلے دو ہم کنٹرول روم سے کچھ فاصلے پر گرے تھے۔  
 ان کے گرنے سے دو چٹانوں کا کچھ حصہ اڑ گیا تھا۔  
 لیکن تیسرا ہم اس سنگ دل نے آبادی پر مارا ہے۔“ کرنل  
 راضی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”اوہ۔ اوہ۔ میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ اس  
 ظلم کا بدلہ اسے دینا ہو گا۔“

”لیکن کیسے۔ ہمیں نہیں معلوم۔ وہ کون ہے۔ اور کہاں  
 ہے۔“ کرنل راضی بولے۔

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ دونوں پارٹیاں پس  
 گیس کے ذخیرے کی حفاظت کے لیے سر دھڑکی ہادی  
 لگا دیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ دشمن ہماری لاشوں پر سے گزر کر  
 ہی کنٹرول روم میں داخل ہو سکتا ہے۔“

”نہیں کرنل صاحب۔ میں چاہتا ہوں۔ وہ ہماری لاشوں  
 پر سے گزر کر بھی کنٹرول روم تک نہ پہنچ سکے۔ انھوں  
 نے کہا۔“

اور باہر نکل گئے۔

”واہ۔ اسے کہتے ہیں وطن پرستی۔“ کرنل راضی کے منہ  
 سے نکلا اور پھر وہ انپیکٹر کامران مرزا وغیرہ کی طرف



بڑھ گئے۔ چند لمحے تک مکمل خاموشی طاری رہی، پھر انپکٹر کامران مرزا بولے :

"میرا خیال ہے۔ آپ کو ایک اور فوجی دستہ یہاں بلوا لینا چاہیے۔ آبادی میں امدادی کام بھی ہو جائیں گے۔ اور کنٹرول روم کے باہر بھی کچھ اور لوگ مقرر کیے جا سکیں گے۔ اگر ہم نے گیس کا بقایا ذخیرہ ضائع نہ ہونے دیا تو یہ ہمارا سب سے بڑا کارنامہ ہو گا۔"

"تجویز معقول ہے۔ میں ہیڈ کوارٹر کو فون کرتا ہوں۔" انہوں نے کہا اور فون پر نمبر گھمانے لگے۔ جلد ہی سلسلہ مل گیا۔ وہ فون پر کسی سے بات کرتے رہے، پھر اچانک ان کے چہرے پر الجھن دوڑ گئی۔ ان کے منہ سے نکلا :

"کیا کہا۔ اوہ اچھا خیر۔" یہ کڑکراہٹوں نے ریسپورڈ رکھ دیا اور ان کی طرف مڑے :

"فوجی دستہ جلد ہی پہنچ جائے گا۔ لیکن افسوس ! مجھے یہاں سے کچھ دیر کے لیے ہیڈ کوارٹر جانا ہو گا۔"

"خیریت تو ہے۔" انپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ایک ضروری میٹنگ بلائی گئی ہے۔ شاید کہیں اور بھی کوئی خرابی موجود ہے۔ ابھی میں خود بھی نہیں جانتا۔" کہ خرابی کیا ہے اور کہاں ہے۔ لیکن شاید واپسی پر بتا

سکوں گا۔

"تب پھر آپ دیر نہ کریں۔ فوراً روانہ ہو جائیں۔ یہاں کے معاملات ہم دیکھ لیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" کرنل راضی نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے کنٹرول روم سے نکل گئے۔

"انہیں گئے ابھی ایک منٹ ہی ہوا ہو گا کہ شوکی زور سے چونکا۔"

## ان کا شکار

باہر نکل کر انھوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔  
تین جگہوں سے دھڑکیں کے بادل اوپر اُٹھ رہے تھے۔

”ان چٹانوں میں وہ نہ جانے کہاں چھپا ہو گا۔ یہ بھی ہو  
سکتا ہے کہ وہ خود نہ ہو۔ اس کا کوئی آدمی چھپا ہو۔  
لیکن ہمیں ہر حال میں اسے تلاش کرنا ہو گا۔“ انپکٹر جمشید  
بڑبڑائے۔

”اس کے پاس اور ہم بھی ہوں گے۔ اور وہ اس علاقے  
کو اور نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ہم پر بھی بم چینک سکتا ہے۔“  
خان رحمان نے پریشان آواز میں کہا۔

”اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پیچھے ہٹ جائیں۔“ انپکٹر  
جمشید نے انھیں گھورا۔

”میرے کہنے کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ خان رحمان  
سکرائے۔

”تب پھر؟“ محمود سوالیہ انداز میں بولا۔

”ہمارے چاروں طرف چٹانیں ہی چٹانیں ہیں۔ کنٹرول روم  
بھی تو چٹانوں کے درمیان بنایا گیا ہے۔ ایسی جگہوں پر تو  
تلاش کرنے کے لیے پوری ایک فوج بھی ناکافی ہو جاتی ہے۔  
ہم تین کیا کر لیں گے۔“ خان رحمان نے کہا۔

”مابوسی کی باتیں نہیں کیا کرتے خان رحمان۔ تم تو پھر ایک  
فوجی ہو آؤ۔ ہم اسے تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں  
لگائیں گے۔“ انپکٹر جمشید نے پُر جوش انداز میں کہا اور ایک  
چٹان پر چڑھتے چلے گئے۔ یہ کافی اونچی تھی۔

”خبردار جمشید۔ تم زبردست خطرہ مول رہے ہو۔ وہ ہمیں  
آسانی سے دیکھ لے گا اور ہم چینک مارے گا۔ اس کو تلاش  
کرنے کا یہ طریقہ ہرگز نہیں ہے۔“ خان رحمان نے تیز  
سرگوشی کی۔

”اگر ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا تو بہت دیر لگ جائے  
گی۔ اور اس کو فرار ہونے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔  
لہذا میں جان بوجھ کر یہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔“ وہ  
سکرائے۔

”بج۔ جی۔ کیا مطلب؟“ محمود نے گھبرا کر کہا۔

”میں چاہتا ہوں۔ وہ ہمیں دیکھ لے اور ہم پر بم چینک



مارے۔ اس طرح کم از کم ہم یہ تو جان جائیں گے کہ وہ کس جگہ موجود ہے۔

”ہوں۔ اچھا۔ اللہ مالک ہے۔“

اب وہ تینوں چٹان پر چڑھ رہے تھے۔ اس کی چوٹی پر پہنچ کر انھوں نے چاروں طرف دیکھا، لیکن رات کی تاریکی میں کچھ نظر نہ آ سکا۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے وہ کچھ دور کی چیز تو دیکھنے کے قابل تھے۔ زیادہ دور کی کوئی چیز انھیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک محمود کے منہ سے نکلا:

”م۔ میں۔ اس طرف کوئی چیز حرکت کرتی محسوس کر رہا ہوں۔“

یہ الفاظ اس نے سرگوشی میں ادا کیے۔ انپیکٹر جمشید اور خان رحمان کی نظریں بھی اس سمت میں جم گئیں۔ اور پھر دونوں چونکے بغیر نہ رہ سکے:

محمود کا خیال غلط نہیں۔ آؤ خان رحمان۔ انپیکٹر جمشید نے پرجوش لہجے میں کہا۔

میں اسی وقت انھیں کوئی چیز گول سی اپنی طرف تیر کی طرح آتی نظر آئی:

”بھو! خان رحمان چلائے۔“

تینوں نے ایک ساتھ چٹان سے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔ اس طرح پھلانگیں لگانا بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو یہ بھی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ وہ سیدہ کسی گہری کھائی میں گر سکتے تھے۔ لیکن۔ اس کے علاوہ وہ گر بھی کیا سکتے تھے۔ ہم تو سیدھا ان کے سروں کی طرف آ رہے تھے۔ ادھر وہ نیچے گرے۔ ادھر ہم چٹان کی چوٹی پر گرا اور ایک زبردست دھماکے سے پٹھا۔ پتھر کے بے شمار ٹکڑے بڑے ٹکڑے بارش کی مانند ان پر گرے، لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنے سروں کو اپنے بازوؤں میں چھپا چکے تھے۔ لہذا پتھر ان کی کمر، ٹانگوں، کندھوں اور بازوؤں پر گرے۔ انھیں شدید چوٹیں آئیں، لیکن سر محفوظ رہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرف دوڑ پڑے جس طرف انھوں نے دشمن کو دیکھا تھا۔ عین اسی وقت انھوں نے دور۔ بہت دور دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ قدموں کی آواز چٹانوں میں کچھ زیادہ ہی گونج رہی تھی:

”یہ۔ ضرور وہی ہے۔ محمود نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”اں! ہمیں ہر حال میں اس تک پہنچنا ہو گا۔ اتنا کہتے ہی انپیکٹر جمشید نے ایک اتنی لمبی چھلانگ لگائی کہ خان رحمان او محمود کو بہت پیچھے چھوڑ گئے۔ انھوں نے بھی اپنی رفتار



بڑھا دی۔ اور چھلانگوں پر چھلانگیں لگائیں، لیکن ان تک نہ پہنچ سکے۔ وہ ان سے ہر آن دور ہوتے چلے گئے۔  
 ”ہم تو بہت پیچھے رہ گئے۔“ انکل۔ محمود نے بے تحاشہ دوڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی۔ یہ جشید پتا نہیں۔ کون سی دنیا کی مخلوق ہے۔“  
 خان رحمان بڑبڑا رہے۔

”مخلوق تو اسی دنیا کی ہیں۔ لیکن۔“ محمود کہتے کہتے رک گیا۔ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ آگے کیا کہے۔  
 ”میں حیران ہوں۔ آخر ان لوگوں کو ہمارے ملک کی گیس ضائع کر کے کیا ملے گا۔“

”سکون۔ لیکن وقتی۔ پاتیار سکون تو صرف نیک کاموں سے ملتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب ایمان ایک اللہ پر ہو۔“  
 انیکٹر جمشید اب انھیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ رُکے بغیر دوڑتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے انیکٹر جمشید کی بلند آواز سنی:

”نہیں میرے دشمن۔ اب میں تمہیں نکلنے نہیں دوں گا۔“

اب انھوں نے انھیں دیکھ لیا۔ وہ ایک چٹان کی اوٹ لیے کھڑے تھے۔ جب کہ دشمن انھیں کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے۔ ان کے عین پیچھے پہنچ گئے۔

”وہ۔ کہاں ہے ابا جان؟“

”اس چٹان کے پیچھے۔“ انھوں نے اشارہ کیا۔

دونوں نے چٹانوں کی طرف دیکھا، لیکن دشمن نظر نہ آیا: کیا اس کے پاس رائل ہے؟

”ہاں۔ لیکن ابھی تک اس نے کوئی فار نہیں کیا۔“

”اور اس طرح تو مقابلہ لمبا ہو جائے گا۔“ خان رحمان بولے۔

”تب پھر تم چکر کاٹ کر اس کی کمر کی طرف پہنچنے کی کوشش کرو۔“ انیکٹر جمشید نے سرگوشی کی۔

”جی ہمت! محمود فوراً بولا۔“

دونوں پر جوش انداز میں نیچے جھکے ہوئے چکر کاٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ اس چٹان کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اب انھیں دشمن صاف نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی ایک رائل تھی۔ اور وہ بہت چوکنے انداز میں سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔

”حیرت ہے۔ اب یہ ہم کیوں نہیں چینگ رہا۔“ محمود نے سرگوشی کی۔

”ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس تین ہی ہم رہے ہوں۔“  
 خان رحمان بولے۔

”نہیں۔ اگر اس کے پاس صرف تین ہم ہوتے۔ تو ان

تینوں کو پھینک مارنے کے بعد اسے چٹانوں میں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”اوہ۔ تب پھر اب یہ ہم کیوں نہیں مار رہا۔ اوہ ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ وہ محمود کے کان میں بولے۔

”مجھے بھی بتادیں، کیا سمجھ گئے؟ محمود حیران ہو کر بولا۔

”اب جشید اس سے بہت نزدیک پہنچ چکا ہے۔ اگر یہ ہم مارتا ہے تو پتھروں کی بارش سے خود بھی محفوظ نہیں رہے گا۔

”اوہ۔ لیکن ہم تو اب اس پر حملہ کر ہی سکتے ہیں۔ محمود نے کہا اور دو پتھر اٹھا لیے۔

”ضرور۔ کیوں نہیں۔ اسی لیے تو آئے ہیں۔ خان رحمان مسکراتے۔

اور محمود نے پہلے ایک پتھر اچھالا۔ پھر دوسرا۔ پہلا پتھر اس کے کندھے پر لگا۔ دوسرا اس کی کمر پر۔ سر کا نشاء محمود نے لیا ہی نہیں تھا، کیوں کہ اس صورت میں وہ کچھ بتانے کے قابل نہ رہ جاتا۔ وہ بُری طرح تڑپا اور سیدھا ہو گیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ خان رحمان نے فوراً رائفل کی طرف چھلانگ لگا دی اور اس کو اٹھاتے ہوئے بولے:

”خبردار۔ اب تم حرکت نہیں کرو گے۔

”ابا جان! اب آپ اس طرف آ سکتے ہیں۔“ محمود بلند آواز میں بولا۔

”بہت خوب۔“ انپکٹر جشید کی آواز سنائی دی۔

جلد ہی وہ بھی وہاں نظر آئے۔ انھوں نے اس کی تلاشی لی۔ کندھے سے نکلے ایک بیگ میں سے چار بم اور ملے۔ بموں کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے بغور اس کا جائزہ لیا اور پھر منہ بنا کر بولے:

”نہیں، بھئی۔ یہ شخص باس نہیں ہو سکتا۔

”یہ آپ نے کیسے کر دیا۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔

ان کے شکار کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نظر آئے۔

”پہلے اس سے پوچھ لو۔ وہ مسکراتے۔

”کیوں بھئی۔ تم باس نہیں ہو کیا؟ خان رحمان بولے۔

”نہیں۔ میں تو باس کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔“ اس نے فوراً کہا۔

”جشید! جلدی بتاؤ۔ تم نے یہ اندازہ کس طرح لگایا؟

”اس قدر بڑا منصوبہ بنانے والا خود بم اٹھائے اٹھائے نہیں پھر سکتا۔ جب کہ اس کے لیے کام کرنے والے بے شمار ہوں۔“ انھوں نے کہا، پھر اس کی طرف مڑے:

"لیکن ہو سکتا ہے۔ یہ حضرت باس کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔"

"نہیں! میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے کہا۔  
"بھئی کچھ تو بتا دو۔ محمود نے درخواست کرنے کے انداز میں کہا۔"

"کیا بتا دوں۔ جب کچھ جانتا ہی نہیں۔"  
"یہ ہم تمہیں کہاں سے ملے؟"

"وائرلیس پر پیغام ملا تھا باس کا۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں چٹان کے دامن میں بموں کا تھیلا پڑا ہے۔ انھوں نے مجھے ہدایات بھی دی تھیں کہ بم کہاں کہاں چسکنے ہیں۔"  
"ادو۔ تو تم نے باس کی ہدایات کے مطابق ہی بم چسکے تھے۔"  
"ہاں بالکل۔ ان کی خاص ہدایت یہ تھی کہ بم کنٹرول روم کو نقصان نہ پہنچائے۔"

"شکریہ۔ کیا تم بھی یہاں کام کرنے والوں میں شامل ہو؟"  
"انپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر پوچھا۔  
"نہیں۔ ہاں۔ اس نے ہکا کر کہا۔"

"کیا مطلب۔ یہ تم نے ہاں کہا یا نہیں؟ خان رحمان نے حیران ہو کر پوچھا۔  
"آدھا نہیں۔ آدھا ہاں۔ محمود مسکرایا۔"

"جواب دو بھئی۔ انپکٹر جمشید کی آواز سرد ہو گئی۔"

"ہاں! میں بھی یہاں کام کرنے والوں میں شامل ہوں۔"  
"بہت خوب۔ تب تو تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔  
تمہارے ہاتھ سر سے بلند رہیں گے اور تم ہمارے آگے آگے کنٹرول روم کی طرف قدم بڑھاؤ گے۔"  
"آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ اس نے گھبرا کر کہا۔  
"نیک سلوک۔ محمود بول اٹھا۔"

"اُس نے محمود کو گھورا اور پھر آگے آگے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ کنٹرول روم میں داخل ہو گئے۔ یہاں حالات بچوں کے توں تھے۔ انپکٹر جمشید نے کرنل راضی کی غیر موجودگی فوراً محسوس کر لی:

"کرنل صاحب کہاں گئے؟"

"انھیں ہیڈ کوارٹر جانا پڑ گیا۔ ضروری میٹنگ کے لیے بلایا گیا ہے؛ تاہم وہ جاتے ہی فوجی دستہ بھیج دیں گے۔"  
"ہمیں۔ راشد زہیری اس وقت نہ جانے کہاں ہوں گے۔  
اس وقت تو کرنل صاحب کے ساتھ پائپ لائن کی طرف جا رہے تھے۔"

"ان کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ انپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔  
"یہ ہیں وہ ذات شریف۔ جنھوں نے بم برساتے ہیں۔"



ان کے سلسلے میں راشد زبیری کی ضرورت ہے۔  
 ”ہم انھیں تلاش کر لاتے ہیں۔ آصف نے فوراً کہا۔

جلدی جاؤ۔“

آصف نے مکھن کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی:  
 ”ارے ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ مکھن گھبرا گیا۔

”سنا نہیں۔ انکل نے کیا کہا ہے۔ جلدی جاؤ۔ آصف نے  
 ہٹنا کر کہا۔

”لیکن انھوں نے یہ کب کہا ہے کہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع  
 کر دو۔ میں اس کے بغیر بھی دوڑ سکتا ہوں۔“ اس نے جل کر  
 کہا اور آصف نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

جلد ہی دونوں راشد زبیری کو ساتھ لیے کنٹرول روم میں  
 داخل ہوئے۔

”زبیری صاحب علی کے باقی لوگوں کے ساتھ آبادی میں تھے،  
 وہاں بے شمار لوگ زخمی پڑے ہیں۔“

”اوہ؟ ان کے منہ سے نکلا۔

”ہم میں سے کم از کم نصف تو ان کی مرہم پٹی کے لیے  
 یہاں سے جا ہی سکتے ہیں۔“ خان رحمان گھبرا کر بولے۔

”ٹھیک ہے خان رحمان۔ تم جس جس کو چاہو، ساتھ لے  
 جاؤ۔“ انھوں نے کہا۔

”لیکن پہلے ہم یہ تو سن لیں کہ آپ نے مسٹر راشد زبیری کو کیوں  
 بلایا ہے۔“ فاروق نے گھبرا کر کہا۔

”اوہ ہاں۔“ انھوں نے چونک کر کہا، پھر راشد زبیری کی طرف  
 مڑے:

”آپ ان صاحب کو دیکھ رہے ہیں زبیری صاحب؟  
 ”جی ہاں بالکل دیکھ رہا ہوں۔ کیوں، کیا بات ہے؟“

”کیا یہ صاحب آپ کے عملے میں شامل ہیں؟  
 ”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ وہ بولے۔

”وہ حیرت زدہ رہ گئے، پھر ان سب کی نظریں ہم پھینکنے والے  
 پر جم گئیں۔ اچانک اس نے ایک چیخ ماری۔“

## نصف کامیابی

انپکٹر جمشید جلدی سے اس کی طرف بڑھے۔ اس کے منہ سے خون کی ایک لکیر نکل کر گال پر ریگ رہی تھی۔  
”اوہ۔ اس نے زہر کھا لیا۔ اے۔ جلدی بتاؤ۔  
باس کون ہے؟“

”بب۔ باس۔ باس۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔“

”ہاں۔ نام بتاؤ۔ کون ہے؟“  
”نہیں۔ نہیں۔ نہیں بتاؤں گا۔ اگر بتانا ہوتا تو زہر کیوں کھاتا۔ اس نے جھٹکا کر کہا۔“

”تو تم۔ باس کا نام جانتے ہو؟“  
”ہاں۔ بالکل جانتا ہوں۔ میں باس کا خاص آدمی ہوں۔  
لیکن افسوس۔ مجھے مرنا پڑ رہا ہے۔ باس کو جیکی کی موت کا ضرور افسوس ہوگا۔ ہاں۔ تم دیکھ لینا۔ وہ ضرور رنج کرے گا۔ اور۔ اور۔ اب۔“

اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

”یہ پہلا آدمی ملا تھا۔ جس نے کہا ہے کہ یہ باس کو جانتا تھا۔“ انپکٹر جمشید بڑبڑائے۔  
”کیا آپ لوگ اس کی تلاشی لے چکے ہیں؟ انپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔“

”ہاں! ہمیں کے علاوہ اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلا، لیکن وہ تلاشی سرسری تھی۔ یہ کہہ کر انپکٹر جمشید اس پر جھک گئے اور اس کی کمر کو ٹٹولا۔ اچانک ان کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے۔ اور پھر ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات نظر آئے،

”یہ۔ اس کی کمر پر چپکے ہوئے تھے۔“

وہ ان کاغذات پر جھک گئے۔ ان کاغذات پر اس کا نام جیکی ہی لکھا ہوا تھا۔ اس کی عمر۔ تعلیم۔ اور دوسرے معاملات، ایک دشمن ملک کے لیے اس کی خدمات کا ذکر تھا۔ کہ اس نے ان کے ملک کو کیا کیا نقصانات پہنچائے ہیں۔ اور یہ کہ دشمن ملک کی طرف سے بہت جلد اسے ایک بڑا عہدہ ملنے والا تھا۔ ان خدمات کے صفحے ہیں۔

یہ معلومات پڑھ کر وہ سب سوچ میں ڈوب گئے۔  
آخر شوکی کی آواز ابھری:

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس سارے معاملے میں ہمارے  
بدترین دشمن بیگال کا ہاتھ ہے۔“

”ہاں! اس میں اب کیا شک رہ جاتا ہے۔“  
”دوسرے یہ کہ ان کے پاس کا تعلق بھی ضرور بیگال سے  
ہی ہے یا کم از کم پاس اس وقت بیگال کے لیے کام کر رہا  
ہے۔“

”لیکن۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ کون ہے؟“  
”اگر سب لوگ اجازت دیں۔ تو میں انکپٹر کا مران مرزا سے  
میلحدگی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ایک مشورہ کریں  
گے اور اس کے بعد اپنا فیصلہ آپ لوگوں کو سنائیں گے۔“  
ایسے میں انکپٹر جمشید بولے۔

”تو ہمارے سامنے ہی مشورہ کر لیں تاکہ آپ کو فیصلہ نہ  
سنانا پڑے۔ مکمن نے منہ بنایا۔“

”نہیں بھئی۔ یہ مشورہ ذرا خاص قسم کا ہے۔“ انکپٹر جمشید  
مکراتے۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ شوکی نے کندھے اچکائے۔  
وہ دونوں ان سے کافی دور جا کر بیٹھ گئے۔ اور کانا

پھوسی شروع کر دی۔  
کنٹرول روم میں گڑ بڑ شروع ہونے سے پہلے ہم ان

غداروں کی تلاش میں جانے لگے تھے۔ وہ پروگرام تو درمیان  
میں ہی رہ گیا۔ اشفاق نے گویا انھیں یاد دلایا۔

”ارے ہاں! واقعی۔ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔  
”اور اس سلسلے میں ہم چھ پارٹیوں میں بھی تقسیم ہو گئے  
تھے۔ آفتاب نے جلدی سے کہا۔“

”کنٹرول روم سے جب تک فرصت نہیں ملے گی۔ ہم  
شاید کہیں نہیں جا سکیں گے۔ اس وقت کا اہم ترین مسئلہ  
پچانا ہے۔ باقی مسئلے اس ایک مسئلے کی پیٹ میں آ گئے ہیں۔“  
”گویا بڑی پھلی نے چھوٹی پھلیوں کو نگل لیا ہے۔ آفتاب  
نے کہا۔“

”ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس پورے کیس کے دوران  
اب ہم کنٹرول روم سے نہیں نکل سکیں گے۔ اخلاق بڑبڑایا۔  
”کوئی بات نہیں۔ یہ کنٹرول روم ہے۔ کوئی جیل خانہ نہیں  
ہے۔ مکمن نے منہ بنایا۔“

”اور اگر ہو تو بھی کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جیل  
میں رہے، حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہے۔  
اولیائے کرام نے بھی اللہ کے دین کے لیے جیلوں کو آباد  
کیا۔“ اشفاق نے جلدی جلدی کہا۔

”بات تو ٹھیک ہے۔“



میں اسی وقت انہوں نے ان دونوں کو اٹھ کر اپنی طرف آتے دیکھا:

”لو بھئی۔ فیصلہ سننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ محمود نے خوش ہو کر کہا۔

”اس کے لیے تیار ہونے کی ضرورت نہیں۔“ آفتاب بولا۔

”ہاں اور کیا۔ آپس میں لڑنے کا ارادہ ہو تو تیاری کی ضرورت پیش آئے گی۔“ مکھن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ایک بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔“ ایسے میں فرزانہ کی آواز گونجی۔

”حیرت ہے۔ تم صرف ایک بات کی بات کر رہی ہو۔“ فرحت مسکرائی۔

”لیکن۔ بات بے بات تو نہیں کر رہی۔“ فرزانہ بولی۔

”یہ حسرت ہی رہی۔ کہ کبھی تم دونوں بھی آپس میں لڑ پڑو۔ آج پھر ہو ہی جائے۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”لڑیں ہمارے دشمن۔“ فرزانہ نے تڑپ سے کہا۔

”کم از کم ہم لوگ تو تمہارے دشمن نہیں ہیں۔“

”آپس میں لڑنے والے دشمن نہیں ہوتے تو کیا ہوتے ہیں۔“ فرحت نے جھٹکا کر کہا۔

”ارے ارے۔ کم از کم تم دونوں تو نہ لڑو۔“ انپکٹر کامران

مرزا نے گھبرا کر کہا۔

”لیجیے۔ آپ بھی ہمیں کہہ رہے ہیں۔ کبھی لڑتے دیکھا ہے ہمیں۔“

”دیکھا تو نہیں۔“ انپکٹر جمشید مسکرائے۔

”اس دیکھنے دکھانے کی بات کو ہلائے طاق رکھ کر کیوں نہ ہم آپ کا فیصلہ سن لیں۔“ محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

”ہاں ضرور کیوں نہیں۔“ کیس نے ایک بالکل نیا موڑ لیا ہے۔ یا یوں کہ لیں کہ نئی کروٹ لی ہے۔ اور اس لیے

یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ میں یا انپکٹر کامران مرزا کچھ دیر کے لیے یہاں سے غائب ہو جائیں۔ اور ایک ضروری کام

سرا انجام دے آئیں۔“ انپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

”اور وہ نئی کروٹ کیا ہے؟ ضروری کام کیا ہے؟“

”یہ دونوں باتیں ابھی راز رکھی جائیں گی۔ آپ لوگوں کو کچھ وقت کے لیے انتظار کرنا پڑے گا۔“

”اوہ! یہ تو ایک انتہائی مشکل کام ہے۔“ شوکی نے گھبرا کر کہا۔

”کیا مطلب۔ کون سا کام؟“ فاروق گھبرا گیا۔

”انتظار کرنا۔ اور کیا۔“ اس نے فوراً کہا۔

”یہاں وقت گزارنے کا احساس شاید ہی ہو گا۔ پل پل

تو حالات کروٹیں بدل رہے ہیں۔ حالات نہ ہوتے اونٹ ہو گئے۔ آفتاب جل کر بولا۔

”ہائیں۔ کیا اونٹ بھی کروٹیں بدلنے لگے؟“

”اچھا بھئی۔ پھر میں چلا۔“ انیکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا۔  
اور وہ مسکرا کر رہ گئے۔ انیکٹر جمشید السلام علیکم کہہ کر کنٹرول روم سے نکل گئے۔

”انکل۔ انکل کہاں گئے ہیں؟ فرحت بولی۔

”تمہارے سامنے تو کھڑا ہوں“ وہ مسکرائے۔

”میرا مطلب دوسرے انکل سے تھا۔“

”وہ ایک بہت ضروری کام سے گئے ہیں۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“

”پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ اس سوال کا فی الحال جواب دیا بھی تو نہیں جا سکتا۔“

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔ آپ دونوں تو یکایک بہت زیادہ پُر اسرار ہو گئے ہیں۔“

”یہ ان کی پُرانی عادت ہے۔“ پروفیسر داؤد مسکرائے۔

”یہ ان کی پُرانی عادت ہے۔“ پروفیسر داؤد مسکرائے۔  
عین اُسی وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور پھر فاروق چمکا:

”ارے۔ اکرام انکل آگئے۔ بھئی واہ مزا آگیا۔“

”صرف تمہیں نہیں۔ ہمیں بھی مزا آگیا۔ کیوں کہ انکل شاہ

بھی ساتھ ہیں۔“

”اور مجھے تو تم لوگ بھول ہی گئے تھے شاید۔“

یہ آواز منور علی خان کی تھی۔ وہ اچھل پڑے۔ آنکھیں پٹی کی پٹی رو گئیں، پھر فرحت ان کی طرف دوڑ پڑی اور پیٹ گئی۔

”ہائیں انکل۔ یہ آپ کہاں سے ٹپک پڑے۔ محمود کے لیے میں حیرت تھی۔“

”ٹپک کہاں پڑا بھئی۔ فرصت کے کچھ دن ملے تھے۔ میں

نے سوچا، اپنے دوست اور بچوں سے ملاقات کر آؤں۔ وہاں

پہنچا تو یہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے۔

گھر سے معلوم ہوا۔ شوکی برادرز کے ہاں گئے ہیں۔ وہاں فون

کیا تو پتا چلا، دارالحکومت گئے ہیں۔ دارالحکومت آیا تو سب لوگ

وہاں بھی نہیں ملے۔ اکرام سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے

بتایا کہ یہ بھی آپ کے پاس جانے کے لیے پُر تول چکے

ہیں۔ لہذا میں کس طرح رک سکتا تھا۔ میں نے بھی آؤ

دیکھا نہ تاؤ۔ ان کے ساتھ آگیا۔

”کاش انکل۔ آپ آؤ بھی دیکھ لیتے اور تاؤ بھی۔“ لیکن نے

حسرت زدہ انداز میں کہا۔

”کیوں کیوں۔ کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔ وہ گھبرا گئے۔

”جی ہاں! خیر ہی تو نہیں ہے۔

”یا اللہ رحم۔ وہ بولے۔

اب سب بیٹھ گئے۔ کنٹرول روم کے پیسے سے وہ ذرا بھی دور نہیں ہٹے تھے۔ اور میٹروں پر ان کی نظریں برابر پڑ رہی تھیں۔ ایسے میں مزور علی غلٹ بولے:

”مسئلہ کیا ہے۔ آپ سب لوگ اس گیس مرکز میں کیا کر رہے ہیں؟

”میں مختصر طور پر بتاتا ہوں۔ اس طرح اکرام اور شاہد بھی باخبر ہو جائیں گے اور اپنا کام یہاں مکمل کر سکیں گے۔

یہ کڑکراہٹوں نے تفصیل کو سنائی۔

”انتہائی خوف ناک حالات ہیں۔ اس طرح تو پورے ملک میں کھرام پچ جاتے لگاتے۔

”لیکن ہمارے دشمنوں کا مقصد صرف یہ نہیں کہ ہمارے ملک میں کھرام پچ جائے۔ بلکہ وہ اس سے بھی دو قدم آگے کی سوچ چکے ہیں۔ انپیکٹر کامران مرزا بولے۔

”اور۔ وہ کیا؟ اکرام اور شاہد نے ایک ساتھ کہا۔

”اس سوال کا جواب اس وقت نہیں دیا جاسکتا۔

”اور خیر۔ کوئی بات نہیں۔ کیا اب ہم اپنا کام شروع کریں۔“

”ہاں! تمہاری کوشش بس یہ ہونی چاہیے کہ کنٹرول روم کی طرف بڑھنے والے ہر خطرے کو کچل دو۔ کھلی اجازت ہے۔ یہ کڑکڑاہٹیں ایک طرف لے گئے اور دبی آواز میں انہیں کچھ ہدایات دیں۔

”بہت بہتر۔ آپ فکر نہ کریں۔ دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

پھر وہ باہر نکل گئے۔ انہیں اپنے اپنے آدمی اور گرد مقرر کرنا تھے۔ اور خود بھی نگرانی کا کام کرنا تھا۔ وہ ہدایات بھی ان کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ دونوں کافی فکر مند نظر آ رہے تھے۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم گیس کا بقایا حصہ بچا لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ غلٹ رحمان کی آواز ابھری۔

”ابھی کیا کہا جاسکتا ہے۔ دشمن آزاد ہے۔ اور ہر قسم کا وار کرنے کی اسے آسانی حاصل ہے۔ انپیکٹر کامران مرزا نے کہا۔

”لیکن اب یہاں دور دور تک سکون ہے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی شروع ہو چکی ہے۔ پروفیسر داؤد بولے۔

”اور دشمن زبردست کامیابی کا نصف حصہ حاصل کرنے کے بعد بقیہ نصف کامیابی حاصل کرنے کے لیے بڑی طرح بے قرار



ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے۔ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس بار وہ جو وار کرے گا۔ پہلے واروں کی نسبت زیادہ بڑا اور خوف ناک ہو گا۔ محمود نے گہرا کر کہا۔

”ہاں! بلکہ اپنی کامیابی کا یقین بھی اسے ہو گا۔ ورنہ وہ کنٹرول روم کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے۔ ہم لوگ یہاں موجود ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے۔ اگر ہم لوگ یہاں نہ پہنچ گئے ہوتے۔ تو گیس کا باقی حصہ بھی بالکل صاف ہو گیا۔ ہوتا۔ اور دشمن کا پروگرام بھی یہی تھا۔ کہ ہم لوگ ادھر نہ آ سکیں۔ وہ تو چاہتا تھا۔ ہم فرنی کے میدان میں دفن ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں بال بال بچا لیا۔ اور اس کے منصوبے کا پہلا حصہ وہاں ناکامی کا شکار ہوا، دوسرا حصہ یہاں ناکام ہوا۔ اس لیے مجھے یقین ہے۔ وہ آخری حملہ کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ اور ادھر انپکٹر جمشید ہم میں نہیں ہیں۔ وہ ایک دوسری سمت مصروف ہیں۔ دُعا کریں۔ وہ جلد آ جائیں۔ میں چاہتا ہوں۔ آخری حملے کے وقت وہ یہیں ہوں۔ انپکٹر کامران کہتے چلے گئے۔

”آپ تو ہمیں ڈرائے دے رہے ہیں انکل۔“ فادوق نے

کانپ کر کہا۔

”میں کیا کروں۔ کیا کر سکتا ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی خوف محسوس کر رہا ہوں۔“

”اوہ۔ یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں آبا جان۔“ آفتاب نے تیز آواز میں کہا۔

”انپکٹر کامران مرزا غلط نہیں کر رہے۔“

دروازے کی طرف سے ایک اجنبی آواز آئی۔

## فائل X-B

انپکٹر جمشید دارالحکومت کے ایک بہت بڑے دفتر میں داخل ہوئے۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ انہیں یہاں اپنا کام مکمل کر کے واپس بھی لوٹنا تھا۔ چونکہ انہوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی، کیوں کہ یہ دفتر کا وقت تو تھا نہیں۔ انہوں نے ر کے بغیر منہ سے صرف انپکٹر جمشید کہا اور آگے بڑھ گئے۔ چونکہ ر کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر موجود انچارج اوگکھ رہا تھا۔ انہوں نے اس کی میز پر ہاتھ مار کر اسے جگایا :

”لگ۔ کون۔ آپ بغیر اجازت۔ اوہ۔ یہ تو آپ ہیں۔“  
 ”شکر ہے۔ سٹر برنی۔ آپ نے مجھے پہچان تو لیا۔ وہ مکرانے۔“  
 ”آپ کو نہ پہچانوں گا۔ وہ ہنسنا۔“

”فائل X-B کی ضرورت ہے۔ یہیں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کروں گا۔“

”جی۔ کیا فرمایا۔ فائل X-B۔ وہ اچھل پڑا۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔“

”ہاں بھتی۔ جلدی کرو۔“

”لیکن جناب۔ فائل X-B دکھانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں ہے۔“

”میں اس پابندی سے باہر ہوں۔ انہوں نے کہا۔“

”لیکن اگر مجھ سے جواب طلبی ہوئی تو؟“

”میں دیکھ لوں گا۔ ٹھکر نہ کریں۔“

”دیکھ لیں۔ کہیں میں اپنی ملازمت سے نہ جاؤں۔“

”ایسا نہیں ہو سکا۔ بلکہ ہو سکتا ہے۔ آپ کو بہت جلد

ترقی مل جائے۔ وہ بولے۔“

”یہ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”کیوں ممکن نہیں۔ میں کر رہا ہوں۔ ایسا بھی ہو سکتا

ہے۔“

”خیر۔ آپ جانیں۔ اس نے کندھے آچکائے اور آٹھتے ہوئے

بولے :

”تہ خانے سے نکال کر لانا ہوگی۔ ویسے کیا یہ بہتر نہیں

ہو گا کہ آپ تہ خانے میں بیٹھ کر ہی اس کا مطالعہ کر لیں۔“

انپکٹر جمشید نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر بولے :

”ہوں ٹھیک ہے۔“

برنی نے تر خانے کا دروازہ کھول دیا۔ دونوں نیچے آئے، یہاں روشنی اور بیٹھے کا بہترین انتظام تھا۔ برنی نے ایک بہت مضبوط سیف کھول کر اس میں سے ایک بہت موٹی فائل نکال کر ان کے سامنے رکھ دی :

”اب مجھے اجازت ہے۔“

”ہاں! اوپر سے دروازہ بند کر دیں۔ جب میں دستک دوں۔ اس وقت کھولیں۔“

”جی بہتر!“

برنی چلا گیا۔ وہ فائل میں کھو گئے۔ پورے نصف گھنٹے کے بعد انھوں نے فائل بند کرتے ہوئے کہا :

”آف مالک۔ یہ میں نے کیا دیکھا ہے۔“

وہ اٹھے اور تر خانے کے دروازے پر آ کر دستک دی۔ پندرہ بیس سیکنڈ گزرنے پر بھی برنی کی آواز سُنائی نہ دی۔ انھوں نے خیال کیا۔ شاید وہ پھر اونگھنے لگا ہے۔ لہذا انھوں نے پھر دستک دی۔

ایک منٹ گزر گیا۔ اب انھوں نے بے چین ہو کر دروازہ دھڑ دھڑا ڈالا۔ ساتھ ہی وہ چلائے :

”مسٹر برنی۔ آپ کہاں مر گئے۔ جلدی دروازہ کھولیں۔“

مجھے بہت دود جانا ہے۔

لیکن ان کی آواز بے کار گئی۔ اب تو ان پر جٹوں سوار ہو گیا۔ وہ پوری قوت سے دروازہ بجانے لگے۔ انھوں نے سوچا۔ شاید چوکیدار تک ہی ان کی آواز پہنچ جائے۔ اور پھر ان کے ناک میں پٹرول کی بو اور دھواں آنے لگا۔

”آف مالک۔ اوپر تو شاید آگ لگا دی گئی ہے۔ اودہ۔“

اودہ۔

انھوں نے خون زدہ ہو کر دروازے کی بناوٹ کو دیکھا۔ بہت مضبوط لوہے کا تھا۔ اور اس کو توڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ دروازے کے پاس سے ہٹ کر وہ تر خانے میں آئے۔ کبھی ادھر گئے۔ کبھی ادھر۔ لیکن تر خانے میں اور کوئی دروازہ نہیں تھا۔ گویا وہ بُری طرح چنن گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا :

”میں اپنی موت سے ڈر کر نہیں رو رہا ہوں۔ موت تو ایک دن آ کر رہے گی۔ مشکل یہ ہے کہ۔ میری باہر بہت ضرورت ہے۔ اگر میں اپنے ساتھیوں تک نہ پہنچا۔ تو۔“

وہ کانپ گئے۔ آگے ایک لفظ نہ کہہ سکے۔ دھواں اب آہستہ آہستہ تر خانے میں جمع ہو رہا تھا، لیکن چوں کہ دروازہ پوری طرح چوکت کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس لیے



اندروں آنے والے دھوئیں کی مقدار بہت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی، لیکن وہ جانتے تھے۔ ایک بار اگر پورا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا تو پھر وہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔ وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔

دھواں بڑھتا چلا گیا۔ بڑھتا چلا گیا۔ ان پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ کھانسی پر کھانسی آتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ بے دم ہو گئے۔ ان کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں۔ پھر وہ رت خانے کے دروازے کے پاس دھڑام سے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔



آواز سن کر انہوں نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں فریجوں کا وہی انچارج کھڑا تھا۔ جس کو کرنل راضی نے باہر مقرر کیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔  
”کک۔ کیا مطلب۔ جناب۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ فاروق نے ہسکلا کر کہا۔

”میں نے کہا ہے۔ انپیکٹر کامران مرزا غلط نہیں کر رہے۔“ اور۔ یہ کیا کر رہے ہیں؟“ آفتاب نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ خوف محسوس کر رہے ہیں نا۔ بس یہی بات ان کی ٹھیک ہے۔“ انچارج نے کہا۔  
”چتا نہیں! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ فاروق نے اسے گھورا۔

”یہ کہ۔ آپ سب کو بھی خوف محسوس کرنا چاہیے۔“ اس نے کہا۔

”بات اب بھی پتلے نہیں پڑی۔“ آصف نے جھٹکا کر کہا۔  
”اچھا تو پھر۔ دروازے کی طرف دیکھیے۔ پتلے پڑ جائے گی بات۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

انہوں نے ایک ساتھ دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کے تمام ساتھی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ رائفلیں بھی جدید قسم کی اور عجیب قسم کی تھیں:

”کک۔ کیا مطلب؟“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔  
لیکن انپیکٹر کامران مرزا نے منہ نہیں کھولا تھا۔

”حیرت ہے۔“ جنتے تو ہیں آپ لوگ سراخ رساں اور اتنی سی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔

”ہم سمجھ چکے ہیں دوست۔ بلکہ اب سے نہیں۔ بہت پہلے سے۔ بہت پہلے ہمیں یہ حیرت ہوئی تھی کہ تم لوگوں کے

باہر موجود ہوتے ہوئے۔ اندر کیسے گڑبڑ ہو گئی۔ اندر جو کچھ بھی ہوا ہے۔ تم لوگوں کے اشارے پر ہوا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہ رہا۔ وہ بولے۔

”بالکل ٹھیک۔ لیکن تم لوگ اب مکمل طور پر شکست کھا چکے ہو۔ کیوں کہ تم سب اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہو۔ باقی رہ گئے انیکٹر جمشید اور ان کے دو ساتھی۔ جب وہ لوٹیں گے تو ہم ان سے بھی ہٹ لیں گے۔“

”ذرا دیکھ بھال کر بٹنا بھائی۔ وہ تینوں ہی بہت خطرناک ہیں۔“ فادوق مسکرایا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان کی خطرناکی کو بھی دیکھ لیں گے۔“ انچارج نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ٹینک تو نظر نہیں آ رہی تمہارے چہرے پر۔“ لیکن نے حیران ہو کر کہا۔

”تم لوگوں نے ابھی تک ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے۔ خیر ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ بھون ڈالو بھی انہیں۔ اب ان کا وجود ہم لوگوں کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔“

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ان پر گولیوں کی بارش ماری گئی۔ لیکن اس سے بھی پہلے وہ لوٹ لگا چکے تھے۔ اور پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ لوٹ لگا جائیں اور ستونوں کے

پچھے نہ پھنیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ پروری طرح اوٹ میں تھے۔

”اب کیا خیال ہے دوستو؟“ انیکٹر کامران مرزا بلند آواز میں بولے۔

”حیرت انگیز۔ تم لوگوں کی پھرتی نے ہمیں بار بار دھچکا پہنچایا ہے، لیکن اب تم لوگ بچ نہیں سکو گے۔“

”ارے نہیں بھئی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ کرنل راضی صاحب مزید فوج ہیڈ کوارٹر سے روانہ کر چکے ہیں۔ وہ کیا ہی چاہتی ہو گی۔“ شوکی نے ہونٹوں کے انداز میں کہا۔

”کیا کر رہے ہو شوکی۔ یہ بھی تو فوجی ہی ہیں۔“ آصف نے منہ بنایا۔

”لیکن سب تو غدار نہیں ہو سکتے۔“

”غدار ہوتے دیر بھی کیا لگتی ہے۔“ فادوق نے جل کر کہا۔

”یہ کہی ہے اس نے پتے کی بات۔“ فوجی انچارج نے خوش ہو کر کہا۔

”کیا مطلب۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو۔ کہ آنے والے فوجی بھی آپ کا ساتھ دیں گے۔“ پروفیسر داؤد نے بوکھلا کر کہا۔

”ہاں بالکل۔“ وہ بولا۔

”تب تو مارے گئے ہم۔ لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“

پرو فیسر داؤد بولے۔

”بس دیکھ لیجیے گا کہ کس طرح ہو گا یہ۔“

”میں جانتا ہوں۔ یہ کس طرح ہو گا۔ انپکٹر جمشید بھی جانتے ہیں۔ لہذا تم لوگوں کو زیادہ خوش ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ انپکٹر کامران مرزا بولے۔“

”ساتھیو۔ ان لوگوں کو ادھر ادھر سے دباتے چلے جاؤ۔ آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ ہمیں اس پیسے تک پہنچنا ہے۔ اسے آٹا گھما کر چھوڑنا ہے۔ اسی وقت صبح مسنون میں کامیاب ہو سکیں گے۔“

”اور کامیاب ہونے کے بعد غداری کا انعام حاصل کر سکو گے۔ شوکی نے تھلا کر کہا۔“

”تمہارے نزدیک ہوگی یہ غداری۔ ہمارے نزدیک نہیں۔ اس نے کہا۔“

”کیا تم۔ ہمارے ملک کے فوجی نہیں ہو؟ ایسے میں آصف نے سوال کیا۔“

”بالکل ہیں۔ ہم اس ملک کی فوج میں شامل ہیں۔ یہ کیوں پوچھا آپ نے؟ انچارج کے لمبے میں حیرت تھی۔“

”میں نے سوچا۔ شاید ہمارے بدترین دشمن کے فوجیوں نے ہمارے ملک کے فوجیوں کا میک اپ کر لیا ہے اور

ان کا لباس پہن لیا ہے۔“

”نہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ ہم بالکل اصلی فوجی ہیں۔ اور اسی ملک کے فوجی ہیں۔“

”تب تم لوگ بدترین دشمن ملک کے آدمیوں سے بھی زیادہ بُرے ہو۔ انپکٹر کامران مرزا کی آواز گونجی۔“

”ہم خود کو ہرگز بُرا نہیں سمجھتے۔ یہ آپ کا خیال ہے، اور کسی کے خیال پر پابندی عاید نہیں کی جاسکتی۔“

”انکل۔ ان کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ اچانک فرزانہ نے کہا۔“

”ہاں! اب ہمیں ان سے باقاعدہ مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔“

”پہلے میں نے سوچا تھا۔ ان پر وار نہیں کروں گا۔“

آخر یہ ہمارے اپنے ملک کے فوجی ہیں، لیکن اب جب کہ

یہ ہماری جانیں لینے کے لیے بڑے چلے آ رہے ہیں تو

میں رک بھی کیسے سکتا ہوں۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں

نے ستون سے ہاتھ نکالتے ہی فائر کر دیا۔ یہ پہلا فائر

تھا۔ جو اس مقابلے میں ہوا، پھر تو بے شمار فائروں کی گونج

سنائی دینے لگی۔ ساتھ میں چینی بھی سنائی دے رہی تھیں۔

”یہ لوگ میری زندگی میں گیس کے پیسے تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

انپکٹر کامران مرزا گرج دار آواز میں بولے۔

”آپ لوگوں کی زندگیوں اب ہیں ہی کتنی دیر کی۔ چند



گھڑیوں کی مہمان ہیں۔" انچارج نے جواب میں کہا۔

ان سب نے ستونوں سے ہاتھ نکال نکال کر دشمنوں پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ لیکن شکل یہ تھی کہ فوجی بھی اپنی طرف کے ستونوں کی اوٹ لے چکے تھے۔ یہ ساری عمارت ستونوں پر قائم کی گئی تھی۔ ستون بہت گولائی لیے ہوئے تھے۔ گویا اب زیادہ تر گولیاں ستونوں پر لگ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دشمن موقع ملتے ہی آگے بھی بڑھ رہا تھا۔ اور ان کا گیرائیگ ہو رہا تھا۔ آخر انہیں آگے بڑھانے والا بھی ایک فوجی تھا۔ اور پھر باہر بے شمار آوازیں گونج اٹھیں :

"شش۔ شاید کرنل صاحب کے پیچھے ہوئے فوجی آ گئے۔"

انچارج نے چلا کر کہا۔

"ہاں ! ہم باہر آ چکے ہیں، لیکن یہ اندر فائرنگ کیسی ہو رہی ہے؟"

"اندر باقاعدہ ایک جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اپنے اپنے مقاصد کی جنگ۔ اس جنگ میں اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو میدان ہمارا ہے۔ پھر ہمارا منصوبہ پورا سمجھو۔ اور اگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ تب بھی ہماری کامیابی کے امکانات ختم نہیں ہو جائیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" باہر سے کہا گیا۔

"باس جیسا منصوبہ ساز بھی کوئی شاید ہی ہو گا۔ انہوں نے

دور دور سے منصوبہ بنایا ہے۔" انچارج بولا۔

"باتیں تو بعد میں بھی کر لیں گے۔ پہلے ان لوگوں کا صفایا

کرنے میں ہماری مدد کریں۔ یعنی اندر داخل ہو جائیں۔"

"ہم آ رہے ہیں۔ دیکھتے ہوئے داخل ہوں گے۔" باہر

سے کہا گیا۔

"مجھے حیرت اکرام اور شاہد پر ہے۔ وہ کہاں چلے گئے۔"

ان کے ماتحت کیا ہوئے؟ انپکٹر کامران مرزا کھوئے کھوئے

لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب؟" انچارج کے منہ سے نکلا۔

"مشر انچارج۔ تمہیں کس بات پر حیرت ہوئی؟"

"اس بات پر کہ وہ دو سب انپکٹر اپنے ساتھیوں کو لے

کر آبادی کی طرف چلے گئے تھے۔ آپس میں کڑے تھے کہ

دشمنوں کی دیکھ بھال کا کام شروع کرتے ہیں جاتے ہی۔"

"ہائیں ! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ انپکٹر کامران مرزا

بولے۔

"کیوں۔ کیا۔ آپ نے انہیں اس قسم کی کوئی ہدایت

نہیں دی تھی؟"

”زخمیوں کی مرہم پٹی۔“

انپکٹر کامران مرزا کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے،  
 اچانک فوجیوں کی پشت پر گولیاں برسائی گئی تھیں۔  
 فوجیوں کی بوکھلاہٹ کا کیا پوچھنا۔ گھبرا کر مڑے ہی تھے  
 کہ انپکٹر کامران مرزا اور ان کے ساتھیوں نے انھیں باڈ پر  
 رکھ لیا۔ باہر سے بھی شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ فوجی کبھی  
 ادھر بھاگے کبھی اُدھر۔ افراتفری نے انھیں اور بھی نقصان پہنچایا،  
 وہ فائرنگ کرنا بالکل بھول گئے۔

شاباش بہادر۔ ان میں سے ایک بھی بچنے نہ پائے۔  
 یہ وطن کے غدار ہیں اور وطن کے غداروں کو بھٹوں ڈالنا ہی  
 نیکی ہے۔ انھیں چھوڑ دیا گیا تو یہ پوری قوم پر چھا جائیں گے۔  
 انپکٹر کامران مرزا نے پرجوش انداز میں کہا۔

ان سب پر جوش طاری ہو گیا۔ گولیوں کی گونج میں  
 اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ادھر گرنے والے فوجیوں کی چیخوں نے  
 تو آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر گر رہے  
 تھے۔ اپنے ہی خون میں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور اپنے  
 ہی ساتھیوں کو روند رہے تھے۔ ایک دوسرے پر گر رہے  
 تھے۔ غرض یہ کہ چند منٹ کے اندر کشتے کے پلٹے لگ  
 گئے۔ ایک بھی فوجی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اور اس

وقت انہوں نے اکرام کی آواز سنی:

”کیوں جناب۔ کیسی رہی۔“

حیرت انگیز۔ انتہائی حیرت انگیز۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے  
 تھے کہ پانسہ اس طرح پلٹ جائے گا۔ لیکن بھئی۔ یہ سب ہوا  
 کس طرح؟ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”میں نے اور شاہد نے چال چلنے کی سوچی تھی۔ ہم نے  
 ظاہر کیا کہ سیدھے آبادی کی طرف جا رہے ہیں، تاکہ زخمیوں  
 کو سنبھالیں، لیکن ہم بہت دور جا کر پھر پلٹ آئے۔  
 اور خفیہ انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ ہم نے سوچا تھا۔  
 کنٹرول روم کی نگرانی خفیہ طور پر کریں گے۔ اور پھر ہم نے  
 فوجیوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ لیا۔ اس وقت ہمارے ماتھے  
 ٹھنکے۔ ہم ابھی آگے بڑھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ہم  
 نے اندر فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ ہم بے چین ہو گئے۔  
 اور فوراً حملہ کرنے کا پروگرام بنایا، لیکن پھر شاہد کے ذہن  
 میں بات آئی کہ ابھی کچھ دیر انتظار کر لینا بہتر ہو گا۔  
 تاکہ صورت حال واضح ہو سکے۔ ٹھہرے رہنے کا فائدہ یہ  
 ہوا کہ مزید فوجی جو آئے۔ وہ بھی اندر داخل ہو گئے۔  
 ورنہ ہم ان کے درمیان میں چھنس جاتے۔ نئے فوجیوں  
 کے اندر داخل ہونے کے بعد ہم کس طرح رک سکتے تھے۔“

ہیں۔ ہم نے آگے بڑھ کر ان پر تابر توڑ فارنگ کر دی۔

”تم لوگوں کا یہ کارنامہ مدتوں یاد رہے گا جی۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”اے شک۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔“ پروفیسر داؤد نے کہا۔

”پھر کیا خیال ہے۔ اس مرتبہ سہرا ان کے سر کیوں نہ باندھ دیا جائے۔“ فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

”جی کیا کہا۔ سہرا۔ ارے باپ رے۔“ اکرام نے گہرا کر کہا۔

”یہ بڑی پارٹی والے آخر سہرے کے نام سے اتنا بدکتے کیوں ہیں؟ آفتاب مسکرایا۔

”سہرا ہے ہی ایسی چیز۔ باندھنے والا بھی پچھتا تا ہے۔

نہ باندھنے والا بھی۔ اور سچوں کو بڑی پارٹی والے ایک ایک سہرا اپنی زندگی میں پہلے ہی بندھوا چکے ہیں۔ اس لیے۔“ پروفیسر داؤد کہتے جا رہے تھے کہ مکھن نے بات کاٹ دی۔

”لیکن انکل۔ وہ ذرا دوسری قسم کا سہرا ہوتا ہے۔“

”دوسری قسم کا ہو یا تیسری قسم کا۔ سہرا تو سہرا ہی ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

”خیر یہ فیصلہ تو بعد میں ہی ہو گا کہ سہرا کس کے سر رہے گا۔ اس وقت تو ہمیں۔“ آصف کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت باہر قدموں کی آواز اُبھری۔ اور پھر ایک آواز اُبھری:

”اندر سب خیریت تو ہے۔“



## جنابِ صدر

اُن کے چہرے دمک اُٹھے۔ آواز انپکٹر جمشید کی تھی۔  
فادوق نے فوراً کہا:

”اگر اتنی لاشوں کی موجودگی میں خیریت کا خیال دل میں  
لایا جا سکتا ہے۔ تو پھر ضرور اندر سب خیریت ہے۔“  
”ہاں! اسی بات پر تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کہ باہر  
ایک بھی آدمی موجود نہیں۔ اور اندر سے باتیں کرنے کی  
آولعزیں آ رہی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئے۔  
اور پھر گہرا کر بولے:

”ارے باپ دے۔ اتنی لاشیں۔“

”جی ہاں! بس اتنے ہی دشمن اندر آئے تھے۔ آفتاب نے  
مسمی صورت بنائی۔“

انہیں حالات سنائے گئے، پھر انپکٹر کامران مرزا نے  
پوچھا:

”آپ کی مہم کا کیا بنا؟“

”میں بھی کامیاب لوٹا ہوں۔ اور ہمارے پاس وقت بہت  
کم ہے۔ درز حالات سناتا۔ یہ سُن لیں کہ موت کے منہ سے  
نکل کر آ رہا ہوں۔ عین وقت پر اگر فائر بریگیڈ والے نہ  
پہنچ جاتے تو میں اس وقت یہاں زندہ موجود نہ ہوتا۔ اب ہمیں  
عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہیں۔“

اکرام اور شاہد اپنے ماتحتوں کے ساتھ یہیں رہیں گے۔  
انکوچہ اب اس پیسے کی طرف کسی کے بڑھنے کے امکانات نہیں  
رہے، پھر بھی انہیں پوری طرح چوکس رہنا ہے۔ اور جان  
کی بازی لگا کر بھی اس کی حفاظت کرنا ہے۔ باقی سب لوگ  
یہاں سے چلیں گے۔“

”لیکن کہاں؟ آصف کے منہ سے نکلا۔“

”جہاں میں لے جاؤں۔ فوری طور پر چلنے کے لیے تیار ہو  
جائیں۔ خبردار کوئی سوال نہیں کرنا۔“

آنکھوں نے چپ سادھ لی۔ صرف تین منٹ بعد وہ وہاں  
سے گاڑیوں میں روانہ ہو رہے تھے۔ ایک گھنٹہ تک ان کا  
سفر نامعلوم منزل کی طرف جاری رہا۔ آخر اگلی گاڑی رک  
گئی۔ انپکٹر جمشید اس سے اتر آئے۔ ان کے ساتھ باقی

سب بھی اترے تھے۔ انھوں نے دیکھا۔ وہ دارالحکومت کے ایک خاص علاقے میں موجود تھے۔ اب انھوں نے پیدل آگے بڑھنا شروع کیا۔ ان سب کے پاس بھرے ہوئے پستول اور دو دھادی خنجر موجود تھے۔ پیدل بھی انھیں پندرہ منٹ تک چلنا پڑا۔ پھر وہ ایک بڑی کوٹھی کے نزدیک پہنچ گئے۔ کوٹھی چاروں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ دروازے پر مسلح پہرے دار موجود تھے۔ لیکن وہ انھیں نہیں دیکھ سکے تھے، کیوں کہ کافی فاصلے سے ہی انھوں نے درختوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پہرے داروں کو دیکھ کر وہ کوٹھی کے پچھلی طرف سرکنے لگے۔ اس طرف دیواریں بہت اونچی تھیں اور کوئی پائپ وغیرہ نہیں تھا۔ ایسے میں انپکٹر جمشید کے اشارے پر منور علی خان آگے بڑھے، انھوں نے اپنے بیگ سے آنکڑا نکالا۔ انپکٹر جمشید نے اس پر دو تین رومال پیٹ دیے۔ یہ احتیاط اس لیے کی کہ اس کے گرنے کی آواز مدہم رہے۔ اور پھر منور علی خان نے آنکڑا اوپر اچھالا۔ وہ پہلی ہی کوشش میں اوپر کہیں الجھ گیا، فادوق فوراً آگے بڑھا اور بندروں کی سی تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے زینے کا رخ کیا۔ زینہ بند نظر آیا۔ اب اس نے رسی اوپر کھینچی۔ اسے صحن

میں لٹکایا اور اس کے ذریعے نیچے اتر گیا۔ دو منٹ بعد کوٹھی کی پشت پر ایک دروازہ کھلا اور فادوق کا چہرہ نظر آیا۔ ان کے چہروں پر رونق دوڑ گئی۔ وہ سب دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ پہلے وہ صحن میں آئے۔ فززانہ کے کافوں نے فوراً ایک سمت میں اشارہ کیا۔ ان کے قدم اس طرف اٹھ گئے۔ ایک بند دروازے کے نزدیک پہنچ کر انھوں نے کان لگا دیے۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں: "اب میں مفعل رپورٹ پیش کرتا ہوں۔ ہم اس وقت تک پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ اس وقت تک گیس کا ذخیرہ پھر سے ضائع ہونے لگ گیا ہو گا۔ صبح تک وہ صاف ہو جائے گا۔ اور اسی لمحے ہم اپنا کام شروع کریں گے، میرا اصل منصوبہ یہ تھا کہ کسی طرح انپکٹر جمشید اور انپکٹر کامران مرزا پارٹیوں کو اصل معاملے کی سن گن تک نہ لگے۔ کیوں کہ اگر انھیں ذرا بھی سن گن لگ گئی تو ہمارے لیے کامیابی حاصل کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے میں نے پہلا وار تو یہ کیا کہ دونوں کو شوکی برادروں کے شہر بھیج دیا۔ اور وہاں انھیں رشی خان کے چکر میں ڈال دیا۔ پھر رشی خان کے ذریعے ہی انھیں فرنی کے میدان میں طلب کیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اندھا دھند فرنی کے میدان میں پہنچ



جائیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ وہ سب کے سب فرٹی کے میدان میں نہیں پہنچے، صرف نصف وہاں گئے۔ اور نصف نے دارالحکومت کا رخ کیا، کیوں کہ گیس کا اخراج شروع ہو چکا تھا۔ اور یہی میری سکیم تھی کہ وہ دارالحکومت پہنچ کر صرف اور صرف یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ گیس ضائع کرنے کے اس عظیم منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے ہی لڑی خان نے انہیں دارالحکومت سے دور بھیج دیا تھا اور وہاں آلبھائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس خیال میں آلبھ بھی گئے۔ کیوں کہ گیس برابر ضائع ہو رہی تھی۔ اور یہ ایک سنگین ترین معاملہ تھا، لیکن ان کی ذہانت کا لوہا بھی ماننا پڑتا ہے، کم بختوں نے گیس کا اخراج بند کرنے کا طریقہ سوچ لیا۔ اور پھید گھا دیا گیا۔ خیر۔ میں نے بھی اس امکان کو اپنے ذہن میں رکھا تھا۔ اور اس بات کا پورا پورا انتظام کر لیا تھا کہ اگر اس طرح وہ لوگ گیس بچانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر راست اقدام کیا جائے گا۔ یعنی پھر کھل کر سامنے آ جائیں گے، چنانچہ اس وقت فوجی ان سب کو جھسم کر چکے ہوں گے اور ہمیں کامیابی کی اطلاع ملنے ہی والی ہو گی۔ ادھر صدر محترم آنے ہی والے ہوں گے۔ گویا ہر تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان لوگوں کو ایک لمحے کے لیے بھی

یہ خیال نہیں گزرا کہ اصل معاملہ گیس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی پوری توجہ گیس پر لگی رہی۔ یہی میرا اصل منصوبہ تھا کہ انہیں گیس کے علاوہ کچھ سوچنے نہ دوں۔ کیسے۔ کیسی رہی۔

بہت خوب۔ بلکہ بہت ہی خوب۔ کئی آوازیں ابھریں۔ میں اُسی وقت سمارت کے اندر گھنٹی بجنے کی آواز گونجی۔

”صدر محترم آگئے۔ گویا۔ یہ کام بھی پروگرام کے مطابق ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق ہم باہر نہیں نکلیں گے۔ وہ خود ہی پرے داروں کے ساتھ یہاں آ جائیں گے؟“

یہ الفاظ سن کر وہ دروازے کے پاس سے پیچھے سرکتے چلے گئے۔ نصف منٹ بعد انہوں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا۔ کہ ان کے ملک کے صدر صاحب پرے داروں کے آگے قدم اٹھاتے چلے آ رہے ہیں۔ پرے داروں نے اس کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”اس طرف سر۔“

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ۔“ صدر صاحب بولے۔

پرے دار واپس سرگئے۔ اور صدر صاحب نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ کھل گیا۔ صدر صاحب اندر داخل ہو گئے۔



دروازہ پھر اندر سے بند کر دیا گیا۔ اور وہ لوگ ایک بار پھر دروازے سے آگے نہ جانے کیوں۔ انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہو رہے تھے :

”صدر محترم۔ خوش آمدید۔“

”ہیں وہ انتہائی اہم خبر سننے کے لیے بے چین ہوں۔ آپ لوگ خود ایوان صدر آ سکتے تھے۔“ صدر صاحب کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

”آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی گئی۔ ہم مجبور تھے۔“

”آخر ایسی کیا مجبوری تھی۔ کچھ پتا بھی تو چلے۔ وہ خبر کیا ہے۔ جو آپ لوگ صحن اور صحن یہاں سنا سکتے ہیں۔“

”خبر بالکل صاف اور مستحضر ہے سر۔ لیکن آپ کے لیے کافی تکلیف دہ ثابت ہو گی وہ جن کے لیے ہم سب معافی چاہتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔ آپ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ صدر صاحب کے لہجے میں بلا کی جھرت تھی۔ اور ہلکی سی مھر تھراہٹ بھی تھی۔

”صحن اور صحن یہ کہ آپ اپنے آپ کو زیر حراست سمجھیں۔ ہم آپ کی حکومت کا تختہ الٹ رہے ہیں اور ملک میں ایک نیا مارشل لا صبح چار بجے سے لگا رہے ہیں۔ ٹھیک پونے چار بجے ہمارے ماتحت تمام مرکزی مقامات پر قابض ہو چکے

ہوں گے۔ آپ کا مسئلہ ہم نے یہیں حل کر دیا۔ بہ آپ کو دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہونا ہو گا۔ کیسے۔ خبر زیادہ تکلیف دہ تو نہیں۔“

انپکٹر جمشید اور انپکٹر کامران مرزا کے علاوہ باقی سب سکتے ہیں رہ گئے۔ گویا اندر سب بڑے بڑے فوجی آفیسر تھے۔ اور ان کا لیڈر وہ تھا۔ جس کی وہ آواز سنتے رہے تھے۔



کئی سینکڑ گزب گئے۔ جواب میں انہوں نے صدر صاحب کی آواز نہیں سنی، پھر وہی آواز ابھری :

”آپ نے کوئی جواب نہیں دیا جناب صدر۔“ لہجے میں گہرا طنز تھا۔

”عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ ہے۔ اگر میرے ذیل ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ تو میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ مجھے اطمینان ہے تو صرف یہ کہ میں نے پورے ملک میں انصاف کا بول بالا کیا۔ غریبوں کے لیے بہت کچھ کیا۔ اور اسلام نافذ کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا رہا۔ شاید میرا قصور بھی یہی ہے۔ کچھ طاقتوں کو خوف محسوس ہوا ہو گا کہ کہیں میں ملک

میں مکمل طور پر اسلام نافذ نہ کر دوں۔ ہمارے ملک میں مکمل اسلام نافذ ہو گیا تو پھر یہ سازشی ملک ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں غلط تو نہیں کر رہا۔ صدر صاحب کی پرسکون آواز سن کر انجمن بہت حیرت ہوئی۔

”نہیں جناب صدر۔ آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔ اس لیے آپ کا وقت اب پورا ہوتا ہے۔ مسٹر شریف۔ صدر صاحب کے دماغ میں گولی اتارنے کا خوش گوار کام آپ انجام دینا پسند کریں گے۔“

”ضرور۔ کیوں نہیں؟ ایک دوسری آواز ابھری۔ وہ بے قرار ہو گئے۔ انپکٹر جمشید نے فوراً دروازے پر دستک دے ڈالی:

”کیا بات ہے۔ اندر سے جھلا کر کہا گیا۔

”سر۔ کوٹھی سے کچھ فاصلے پر کوئی عجیب بات ہے۔ جلدی دروازہ کھولیں۔ انہوں نے پہرے دار کی آواز میں گھبرا کر کہا۔

”ٹھہرو۔ اندر سے کہا گیا۔ پھر فوراً ہی دروازہ کھلا۔ ساتھ ہی دروازہ کھولنے والے کی ٹھوڑی پر ایک مسکاسی قدر طاقت سے لگا کر وہ پیچھے کی طرف اچھل کر اپنے ایک ساتھی پر گرا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ کرسی سمیت لڑھک گیا۔

ادھر انپکٹر کامران مرزا نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ جو پستول صدر صاحب کی کن پٹی سے لگا چکا تھا۔ اس نے بھی فوراً اپنا رخ بدلا۔ پستول والا ہاتھ حرکت میں آیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا۔ انپکٹر کامران مرزا اس پر آ گئے۔ وہ دھڑام سے گرا۔ کمرے میں ہل چل مچ گئی۔ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن اسی وقت انپکٹر جمشید کی سرد آواز نے سب کو چونکا دیا:

”خبردار۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ ورنہ ایک بھی نہیں بچے گا۔“  
”نشینی انداز میں ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ اندر موجود تمام لوگوں کی آنکھیں مارے حیرت کے پٹی پڑ رہی تھیں۔ کرنل راضی۔ آپ ہم لوگوں کو یہاں دیکھ کر حیران نہیں ہوئے۔“ فاروق نے چمک کر کہا۔

”کرنل کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ شاید آپ میں بولنے کی سکت نہیں رہ گئی۔ آفتاب بولا۔  
”ایسی بات نہیں۔ میں اب بھی بول سکتا ہوں۔ بلکہ چمک بھی سکتا ہوں۔“ کرنل راضی نے منہ کھولا۔

”جنت خوب۔ واقعی آپ باہمت ہیں۔ ہاں تو میں نے پوچھا تھا۔ ہمیں یہاں دیکھ کر آپ کو حیرت نہیں ہوئی۔“  
”کوئی ایسی ویسی۔ میں تو مارے حیرت کے مرا جا رہا ہوں۔“

وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپ لوگ یہاں بھی آٹھیکیں گے۔ اس نے جتنا کر کہا۔

”ٹھیک تو اب ہم پڑے ہیں۔ آگے چلیے۔“

”لیکن کیسے ٹھیک پڑے۔ یہ بھی تو بتا دیں۔“

”یہ بات تو بس آبا جان بتا سکتے ہیں۔“ فاروق نے انپکڑ جشیہ کی طرف دیکھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ یہ بات تو بتانا ہی ہوگی۔ ورنہ مرزا نہیں آئے گا۔“ انپکڑ جشیہ مسکرائے۔

”تو پھر بسم اللہ کیجیے۔ ہم لوگ بھی تو آپ کے جھٹے کے واقعات سے بے خبر ہیں۔“ شوکی نے کہا۔

”کرنل صاحب سے جب گیس پلانٹ میں ہسی ملاقات ہوئی تو اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سارے منصوبے کا اصل آدمی یہ ہوگا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے ایک حرکت کی۔ اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنی چھڑی کو دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ چھڑی انھوں نے پنڈلی پر ماری۔ اس وقت بھی میں نے توجہ نہیں دی، لیکن جب انھوں نے دوبارہ پھر یہی حرکت کی تو مجھے حیرت سی ہوئی۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے یہ اپنی اس حرکت کو سب پر ظاہر کر دینا چاہتے ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ خان رحمان زور سے چونکے۔

”خان رحمان سمجھ گئے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔“ خیر سنیے۔

میں نے موقع ملنے پر یہ بات انپکڑ کامران مرزا کے کان میں کہی، انھوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ خود وہ بھی چونکے تھے، لیکن اظہار نہیں کیا تھا۔ اور جب انھوں نے تیسری مرتبہ یہی حرکت کی تو ہم دونوں نے بغور ان کی حرکت کو نوٹ کیا۔ ہم نے صاف جان لیا کہ وہ اپنی اس حرکت کو خوب ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں سوال گونجا کر کیوں، آخر یہ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ آخر میں نے ملٹری ریکارڈ آفس پہنچا۔ اس وقت دروازے پر موجود چوکیدار کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ جس حادثے کا شکار مجھے ہونا پڑا۔ میں اس سے صاف بچ جاتا۔ دراصل میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمارا چالاک مجرم ہمارے اس طرف آنے کے امکان کو بھی نظر میں رکھے گا۔ اور اس نے واقعی نظر میں رکھا تھا۔ اس نے چوکیدار اور کلرک کو بھاری رشوت دے کر اس بات پر تیار کر دیا تھا کہ اگر میں یا ہم میں سے کوئی اس طرف آئے تو اسے ختم کرنے کا انتظام کر لیا جائے۔ ان دونوں کو ضرور بھاری رقم دی گئی ہوگی اور انھوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ مجھے یہ خانے میں بند کر دیا اور اوپر آگ لگا دی۔ وہ تو فائر بریگیڈ وقت پر



دہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپ لوگ یہاں بھی آچکیں گے۔ اس نے جتنا کر کہا۔

”ٹیک تو اب ہم پڑے ہیں۔ آگے چلیے۔“

”لیکن کیسے ٹیک پڑے۔ یہ بھی تو بتا دیں۔“

”یہ بات تو بس ابا جان بتا سکتے ہیں۔“ فاروق نے انپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ یہ بات تو بتانا ہی ہوگی۔ ورنہ مرزا نہیں آئے گا۔“ انپکٹر جمشید مسکراتے۔

”تو پھر بسم اللہ کیجیے۔ ہم لوگ بھی تو آپ کے جھٹے کے واقعات سے بے خبر ہیں۔“ شوکی نے کہا۔

”کنٹرل صاحب سے جب گیس پلانٹ میں پسلی ملاقات ہوئی تو اس وقت میرے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سارے منصوبہ کا اصل آدمی یہ ہوگا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے ایک حرکت کی۔ اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنی چھڑی کو دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ چھڑی انھوں نے پنڈلی پر ماری۔ اس وقت بھی میں نے توجہ نہیں دی، لیکن جب انھوں نے دوبارہ پھر یہی حرکت کی تو مجھے حیرت سی ہوئی۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے یہ اپنی اس حرکت کو سب پر ظاہر کر دینا چاہتے ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ خان رحمان زور سے چونکے۔

”خان رحمان سمجھ گئے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ خیر سنیے۔ میں نے موقع ملنے پر یہ بات انپکٹر کامران مرزا کے کان میں کہی، انھوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ خود وہ بھی چونکے تھے، لیکن اظہار نہیں کیا تھا۔ اور جب انھوں نے تیسری مرتبہ یہی حرکت کی تو ہم دونوں نے بغور ان کی حرکت کو نوٹ کیا۔ ہم نے صاف جان لیا کہ وہ اپنی اس حرکت کو خوب ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں سوال گونجی کہ کیوں، آخر یہ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ آخر میں نے ملٹری ریکارڈ آفس پہنچا۔ اس وقت دروازے پر موجود چوکیدار کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ جس حادثے کا شکار مجھے ہونا پڑا۔ میں اس سے صاف بچ جاتا۔ دراصل میرے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمارا چالاک مجرم ہمارے اس طرف آنے کے امکان کو بھی نظر میں رکھے گا۔ اور اس نے واقعی نظر میں رکھا تھا۔ اس نے چوکیدار اور کلرک کو بھاری رشوت دے کر اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ اگر میں یا ہم میں سے کوئی اس طرف آئے تو اسے ختم کرنے کا انتظام کر لیا جائے۔ ان دونوں کو ضرور بھاری رقم دی گئی ہوگی اور انھوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ مجھے بڑے خاندان میں بند کر دیا اور اوپر آگ لگا دی۔ وہ تو فائر بریگیڈ وقت پر

پہنچ گیا۔ ورنہ میں ختم تھا۔ تہ خانے میں بیٹھ کر میں نے کرنل راضی کی فائل کا غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اس میں کرنل راضی کی یہ خاص عادت لکھی تھی کہ اپنی چٹری کو اپنی پینڈلی پر مارتے رہتے ہیں، لیکن فائل میں ایک اور بات لکھی تھی۔ یہ کہ کرنل راضی نمائش کے بالکل عادی نہیں ہیں، یہ پڑھ کر میں دھک سے رہ گیا، کیوں کہ جس کرنل راضی سے ہمارا سامنا ہوا تھا۔ وہ تو باقاعدہ دکھا کر چٹری پینڈلی پر مارتا تھا۔ خیر۔ تہ خانے سے نکل کر میں نے ہیڈ کوارٹر کے نمبر ملائے۔ اور اپنا نام بتا کر کرنل راضی کے بارے میں معلوم کیا۔ ادھر سے بتایا گیا کہ کرنل راضی تو گیس پلانٹ کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ سن کر پوچھا کہ وہ وہاں سے واپس نہیں لوٹے۔ جواب میں نہیں کہا گیا۔ مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ تو سب کے سامنے یہ کہ کر رخصت ہوئے تھے کہ انھیں ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے۔ میں نے ہیڈ کوارٹر کے اس آدمی سے یہ بھی پوچھا کہ کیا وہاں اس وقت کوئی میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس سوال کے جواب میں بھی نہیں کہا گیا۔ اب تو میری سٹی گم ہو گئی۔ اب میں نے کرنل صاحب کے گھر کے نمبر ملائے۔ اور ایک انجانی آواز میں کہا۔ کرنل صاحب سے

بات کرا دیں۔ ملازم نے کہا کہ وہ بہت مصروف ہیں۔ اس وقت بات نہیں کر سکتے۔ آپ کل کسی وقت فون کیجیے گا۔

مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ کرنل راضی تو اپنے گھر میں تھے۔ اب میں نے سارے حالات کا شروع سے آندر تک جائزہ لیا۔ اور مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ سارا کیا دھرا کرنل راضی کا ہے۔ میں فوراً گیس پلانٹ پہنچا۔ وہاں کئے حالات سن کر اور فوجیوں کی غداری کے بارے میں جان کر اور بھی یقین ہو گیا۔ لہذا میں آپ سب کو لے کر یہاں آ گیا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ یہاں صدر صاحب کو بھی بلایا جا چکا ہے۔ ویسے جناب صدر۔ آپ یہاں کیسے آ گئے۔ آپ نے انھیں ایوان صدر کیوں نہ بلایا۔ انسپکٹر جمشید یہاں تک کہ کر خاموش ہو گئے۔

”کرنل راضی نے مجھ سے اتنا کہا تھا کہ ایک عجیب ترین صورت حال سامنے آئی ہے۔ لہذا خفیہ ملاقات بہتر رہے گی اور اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ میں ان کے ہاں پہنچ جاؤں، میں پریشان ہو گیا۔“

”خیر۔ ایسا ہونا ہی تھا۔“

”لیکن جمشید۔ کرنل راضی کہاں ہیں۔ اور یہ کون ہے؟“



انہوں نے نقلی کرنل راضی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ نقلی کرنل راضی ہیں۔ ان کے ساتھ اس وقت جتنے بھی فوجی افسر ہیں۔ وہ سب کے سب نقلی ہیں۔ اصلی ان میں ایک بھی نہیں۔“

”نہیں !!! ان سب کے منہ سے نکلا۔“

”جی ہاں۔ اصلی آفیسر اپنے گھروں میں دوسرے تمام افراد سمیت مصیبت میں ہوں گے۔ یا تو انہیں قید میں رکھا گیا ہے۔ یا بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ ورنہ اس کے بغیر یہ اپنے منصوبے پر عمل کر ہی نہیں سکتے تھے۔“

”گو یا نقلی کرنلوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کا پروگرام بنایا تھا۔“ صدر صاحب کے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں ! بالکل یہی بات ہے۔ یہ سب کے سب نقلی ہیں اور نقلی کرنل راضی کے ماتحت ہیں۔ یعنی بیگال کے ایجنٹ ہیں۔“

”اُٹ مالک ! اس قدر خوف ناک منصوبہ۔“ صدر صاحب کانپ گئے۔

”لیکن۔ سوال تو یہ ہے کہ کرنل راضی کے چہرے کے پیچھے کس کا چہرہ چھپا ہے۔“ فرزاد بولی۔

”صاف ظاہر ہے۔ رشی خان کا ہو گا۔“ آصف بول

اٹھا۔

”ہاں آصف۔ تم نے ٹھیک کہا۔“ انپکٹر جمشید مکرانے۔

”اوہ۔ اوہ۔“ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

”لیکن جمشید ان لوگوں نے کرنلوں کی چال ڈھال، آواز، طبع،

وضع قطع آخر کس طرح اپنائی؟“ صدر صاحب بولے۔

”ریکارڈ روم کے ریکارڈ کیپر کو خرید لیا گیا۔ اس سے ریکارڈ

کی نقلیں حاصل کی گئیں۔ آواز کے ٹیپ حاصل کیے گئے۔

بلکہ ان کی وڈیو فلمیں حاصل کی گئیں۔ وہ اس طرح کہ مختلف

تقریبات میں کرنلوں وغیرہ کی وڈیو فلمیں بنائی جاتی ہیں

اور پھر انہیں ریکارڈ میں رکھا جاتا ہے۔ لہذا یہ فلمیں بھی

حاصل کی گئیں۔ ریکارڈ روم کو آگ لگانے کا ایک مقصد یہ

بھی تھا کہ چیکنگ نہ کی جا سکے۔ اور جب ان لوگوں نے وہ

فلمیں حاصل کر لیں تو انہیں چلا چلا کر دیکھا گیا۔ ہر ایک

کی حرکات اور سکناٹ کی پوری طرح نقل کرنے کی اس سے

بہتر ترکیب کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور پھر جس منصوبے

کا انچارج رشی خان جیسا چالاک آدمی ہو۔ وہاں کسی کو

شک کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ حضرت خود اپنی ذرا سی

غلطی سے مار کھا گئے۔ کیوں مسٹر۔“ انپکٹر جمشید کہتے کہتے

رک گئے۔



”آپ رشی خان کہتے کہتے رک گئے۔ اس کی بھی ضرورت کوئی اہم وجہ ہے۔ اور میں شروع سے ہی یہ بات بھی محسوس کر رہا ہوں کہ رشی خان بھی دراصل رشی خان نہیں ہے۔ کوئی اور ہی شخصیت ہے۔ انپیکٹر کامران مرزا مکرانے۔“

”جی۔ کیا مطلب؟“ آن سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

## مسٹر مجرم

پہنچنے تک موت کا سناٹا طاری رہا، پھر انپیکٹر جمشید کی آواز گونجی:

”مجھے انپیکٹر کامران مرزا کے اندازے پر حیرت ہے۔ انہوں نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔“

”اوہ۔ تو اس کا مطلب ہے۔ یہ حضرت کوئی چھپے رستم ہیں۔“

فرحت نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

”ہاں! پہلے ان کا میک آپ اتاروں گا اور پھر ان کا تعارف کراؤں گا۔“ انپیکٹر جمشید بولے۔

”آپ کا مطلب ہے۔ میک آپ اتارے جانے کے بعد بھی ہم ان حضرت کو نہیں پہچان سکیں گے۔“

”بالکل نہیں۔ یہی تو اس کا کمال ہے۔“

”تب ہم یہ کمال ضرور دیکھیں گے۔“

”ٹھہرو جمشید۔ میک آپ میں اتاروں گا۔“ یہ کہہ کر خان رحمان

سے پہلے کچھ کام کیے تھے۔ ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ جب ہم اس عمارت میں داخل ہو جائیں تو باہر کھڑے پیراؤں کو نہایت خاموشی سے ہٹا دیا جائے۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا جائے اور باہر موجود بھی رہا جائے۔ اور یہ کہ کسی کو بھی عمارت سے نکلنے نہ دیا جائے جب تک کہ میں نہ کہوں۔

”اوہ۔ گویا عمارت کے ارد گرد آپ کے خاص آدمی موجود ہیں۔ محمود نے پُر جوش انداز میں کہا۔

”ہاں! مسٹر مجرم۔ اب خود کو قانون کے حوالے کر دو۔“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔

”آخر یہ ہے کون آیا جان؟“ فرزاد کی حیرت میں ہر لمحے

اضافہ ہو رہا تھا۔

”تم شوکی کے دفتر کی میز کو سنبھول گئیں فرزاد۔“ انسپکٹر جمشید نے پُر اسرار انداز میں کہا۔

”کیا مطلب۔ اس وقت اس میز کا ذکر کہاں سے نکل آیا؟“ شوکی بولا۔

”بھئی ذکر کا کیا ہے۔ کسی چیز کا ذکر کسی وقت بھی نکل سکتا ہے۔“ فاروق نے مذہباً بنا کر کہا۔

”نکل سکتا ہوگا آپ کی طرف۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔“

آگے بڑھے۔

”ہرگز نہیں خان رحمان۔“ ریک جاؤ۔ انسپکٹر جمشید چلائے۔

لیکن اس وقت تک خان رحمان اتنا آگے بڑھ چکے تھے کہ رکنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اُن کے ناک پر مجرم کا ایک ”مکنا لگا۔ وہ زور سے اُچھل کر پروفیسر داؤد پر گرے۔ دونوں دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ اور رشی خان کمرے سے باہر تھا۔“

”دھت تیرے کی۔“ محمود نے جھلک کر ران پر ہاتھ مارا۔

انسپکٹر جمشید نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی، پھر تو سبھی دوڑ پڑے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید چلائے:

”نہیں دوست۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ جب کہ میں جانتا ہوں۔ میرا مقابلہ کس سے ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے، میں نے تمہارے فرار ہو جانے کے امکانات کا جائزہ لے لیا ہوگا۔“

ان کے آٹھ قدم رک گئے۔ عمارت کا بیرونی دروازہ باہر سے بند تھا۔ رشی خان دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن دروازہ بند پا کر پھر ان کی طرف مڑا،

”یہ۔ یہ دروازہ باہر سے کس طرح بند ہو گیا۔“

”میں نے ریکارڈ روم سے گیس پلانٹ کی طرف روانہ ہونے

اخلاق نے جل کر کہا۔

"ہائیں ہائیں۔ اچھا آفتاب کے لمبے میں حیرت تھی۔

اس وقت مجرم نے پھر ایک چھلانگ لگائی اور انپکٹر جمشید کے سینے سے ٹکرایا۔ انہیں ذرا بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس بندھن میں بھی حمد کرنے کی جرأت کرے گا۔

وہ چاروں شانے چت گرے۔ اور مجرم نے زینے کا رخ کیا۔

"ارے ارے۔ کیا جھٹ سے چھلانگ لگاؤ گے۔ میں اس کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔ ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں گے تمہارے۔ انپکٹر کامران مرزا نے چلا کر کہا اور خود بھی اوپر کی طرف پکے، باقیوں نے بھی زینے کا رخ کیا۔ جب وہ اوپر پہنچے تو انپکٹر کامران مرزا مجرم کی ایک ٹانگ پکڑے کھڑے تھے۔ اور وہ ان کے سامنے کہنیوں کے بل بیٹھا ہوا تھا:

"اسے کیا ہوا؟

"آخری سیڑھی پر پہنچ چکا تھا کہ ٹانگ میرے ہاتھ میں آگئی۔

"اور اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کیا۔

"شاید تم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ انپکٹر کامران مرزا نے

مسکرا کر کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ اس نے کہا اور ٹانگ کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔

انپکٹر کامران مرزا بری طرح لڑکھڑائے۔ ٹانگ ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ان کا رنگ اڑتا نظر آیا۔ ساتھ ہی ان کے منہ سے نکلا:

"اوہو۔ میں نے غلط اندازہ لگایا تھا۔

"اب صحیح اندازہ لگانے کا وقت رہا بھی کہاں۔ وہ منڈیرے ایک درخت کی شاخ پر چھلانگ لگا چکا ہے۔ شاید بندروں کی صحبت میں رہتا رہا ہے۔ آفتاب نے منہ بنا کر کہا۔ سب منڈیر کی طرف دوڑے۔ وہ واقعی بندر کی مانند درخت پر سے اتر رہا تھا۔

"میں بھی اسی راستے سے جاؤں گا۔ انپکٹر کامران مرزا غڑائے اور انہوں نے بھی درخت کی شاخ پر چھلانگ لگا دی۔ پھر درخت پر سے اترنے کی بجائے۔ شاخ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

درخت بہت بلند تھا۔ وہ دھم سے گرے۔ اس وقت تک مجرم درخت کے درمیان میں پہنچ سکا تھا۔ انہیں نیچے گرتے اور گرنے کے بعد اٹھتے دیکھ کر وہ ٹھٹھا۔ شاید اسے بھی حیرت کا ایک جھٹکا لگ ہی گیا تھا۔ وہ وہیں رک گیا۔

"رک کیوں گئے مہربان۔ آؤ۔ آؤ۔

"یہیجے۔ آگیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔



اس نے بھی وہیں سے ان کے اوپر چلانگ لگا دی۔  
انپکٹر کامران مرزا فوراً غوطہ لگا گئے۔ وہ زمین پر گرے۔ ساتھ  
ہی انپکٹر کامران مرزا نے اس پر چلانگ لگائی۔ ایسے میں  
فادوق نے کہا:

”ان ملاقاتیں ہم چھت پر نہیں رہ سکتے۔“

یہ کہہ کر اس نے بھی درخت کی شاخ پر چلانگ لگا دی،  
باقی نیچے کی طرف بھاگے۔ نیچے پہنچے تو دروازہ کھلا نظر آیا۔  
اور انپکٹر جمشید غائب تھے:

”ارے۔۔۔ یہ آبا جان کہاں چلے گئے؟ محمود چونکا۔

”اس وقت یہ سوچنے کا وقت کہاں ہے۔“ آصف بولا۔

وہ بے تحاشہ دوڑتے ہوئے اس سمت میں آئے جہاں  
لڑائی لڑی جا رہی تھی۔ ان کے دوڑتے قدموں کی آواز سن  
کر انپکٹر کامران مرزا نے ان کی طرف دیکھ لیا۔ بس۔ مجرم  
کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ بے تحاشہ بھاگ نکلا۔ اب  
سب کے سب اس کے پیچھے دوڑے:

”آخر ہم پستول یا خنجر کیوں استعمال نہیں کر رہے؟ شوکی نے  
چلا کر کہا۔

”اسے زندہ پکڑیں گے۔ چڑیا گھر میں رکھنے کے کام آئے گا۔“  
آفتاب بولا۔

”لیکن فی الحال تو اس نے ہمیں چڑیا گھر کے جانور بنا کر  
رکھ دیا ہے۔ لیکن نے مسمی صورت بنائی۔  
”ہاں واقعی۔ اتنے تیز طرار جانور۔ میرا مطلب ہے۔ دشمن سے  
کم ہی واسطہ پڑا ہوگا۔“

اب سب سر پیٹ دوڑ رہے تھے۔ اور درمیانی فاصلہ لمحہ  
بہ لمحہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ انپکٹر کامران مرزا اگرچہ ان سب  
سے آگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مجرم سے نزدیک  
ہونے کی بجائے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اور انہوں نے  
صاف محسوس کر لیا تھا۔ وہ ان سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔  
پھر وہ دور ہوتے ہوتے۔ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔



”لو بھئی۔ وہ تو گیا۔“ خان رحمان نے ہانپتے ہوئے کہا۔  
”ہم دوڑ جاری رکھیں گے۔“ انپکٹر کامران مرزا خراٹے۔  
”کیا فائدہ۔“ محمود بولا۔

”فائدہ اور نقصان بعد میں دیکھیں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”جی بہت بہتر۔“ فادوق نے جلدی سے کہا۔

انہوں نے دوڑ جاری رکھی۔ مجرم کا دور دور تک نشان نظر

اس نے بھی وہیں سے ان کے اوپر چلانگ لگا دی۔  
انپکٹر کامران مرزا فوراً غوطہ لگا گئے۔ وہ زمین پر گرے۔ ساتھ  
ہی انپکٹر کامران مرزا نے اس پر چلانگ لگائی۔ ایسے میں  
فادوق نے کہا:

”ان حالات میں ہم پخت پر نہیں رہ سکتے۔“

یہ کہہ کر اس نے بھی درخت کی شاخ پر چلانگ لگا دی،  
باقی نیچے کی طرف بھاگے۔ نیچے پہنچے تو دروازہ کھلا نظر آیا۔  
اور انپکٹر جمشید غائب تھے:

”ارے۔ یہ آبا جان کہاں چلے گئے؟ محمود چوڑکا۔“

”اس وقت یہ سوچنے کا وقت کہاں ہے؟“ آصف بولا۔

وہ بے تحاشہ دوڑتے ہوئے اس سمت میں آئے جہاں  
لڑائی لڑی جا رہی تھی۔ ان کے دوڑتے قدموں کی آواز سن  
کر انپکٹر کامران مرزا نے ان کی طرف دیکھ لیا۔ بس۔ مجرم  
کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ بے تحاشہ بھاگ نکلا۔ اب  
سب کے سب اس کے پیچھے دوڑے:

”آخر ہم پستول یا خنجر کیوں استعمال نہیں کر رہے؟ شوکی نے  
چلا کر کہا۔“

”اسے زندہ پکڑیں گے۔ چڑیا گھر میں رکھنے کے کام آئے گا۔“  
آفتاب بولا۔

”لیکن فی الحال تو اس نے ہمیں چڑیا گھر کے جانور بنا کر  
رکھ دیا ہے۔“ مکھن نے مسمیٰ صوخت بنائی۔  
”اُن واقعی۔ اتنے تیز طرار جانور۔ میرا مطلب ہے۔ دشمن سے  
کم ہی واسطہ پڑا ہوگا۔“

اب سب سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ اور ذرمیانی فاصلہ لمحہ  
بہ لمحہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ انپکٹر کامران مرزا اگرچہ ان سب  
سے آگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مجرم سے نزدیک  
ہونے کی بجائے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اور انھوں نے  
صاف محسوس کر لیا تھا۔ وہ ان سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔  
پھر وہ دور ہوتے ہوتے۔ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔



”لو بھئی۔ وہ تو گیا۔“ خان رحمان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”ہم دوڑ جاری رکھیں گے۔“ انپکٹر کامران مرزا غڑائے۔

”کیا فائدہ۔“ محمود بولا۔

”فائدہ اور نقصان بعد میں دیکھیں گے۔“ انھوں نے کہا۔

”جی بہت بہتر۔“ فادوق نے جلدی سے کہا۔

انھوں نے دوڑ جاری رکھی۔ مجرم کا دور دورہ ٹیک نشان نظر

نہیں آ رہا تھا۔ پھر کوئی انہیں بہت دُور کھڑا نظر آیا۔

”ہائیں۔ اس نے دوڑنا کیوں بند کر دیا۔“ شوکی بولا۔

”تھک گیا ہو گا بے پارہ۔ یا پھر ہمیں چڑانے کے لیے رک گیا ہو گا۔“ جوں ہی ہم قریب پہنچیں گے۔ وہ پھر دوڑ پڑے گا۔“ فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں فرزانہ۔ یہ دونوں ہی باتیں نہیں ہیں۔“ انپکٹر کا مرن

مرزا مسکرائے۔

”جی۔ تو پھر تیسری بات کون سی ہے؟“ فرحت جلدی سے بولی۔

”اس سے آگے دیکھو۔ وہاں کوئی اور کھڑا ہے۔“ وہ مسکراتے۔

انہوں نے چونک کر مجرم سے آگے دیکھا۔ وہاں انہیں انپکٹر

جمشید کھڑے نظر آتے۔ حیران ہی تو رہ گئے سب۔

”کمال ہے۔ انکل یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ آصف بڑبڑایا۔

”شاید انہوں نے ہوش میں آتے ہی اس طرف دوڑ لگا

دی تھی۔ جب کہ ہم لوگ اپنے دشمن سے درخت کے پاس لڑ

رہے تھے۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ مجرم وہاں سے

بھی نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لہذا کیوں نہ آگے پہنچ کر

اس کا راستہ روکا جائے۔“ فرزانہ نے بے جوش انداز میں کہا۔

”ہوں۔ رات تو وہ واقعی روکے کھڑے ہیں۔“

آخر وہ سب ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ مجرم نے بھی ان

کی آمد کو محسوس کر لیا۔ ایک نظر ان پر ڈالی اور مسکرا کر بولا:

”انپکٹر جمشید۔ آپ کو ان لوگوں کا انتظار تھا نا۔“

”نہیں۔ میں تو تمہارے حملے کا انتظار کر رہا تھا۔“ انپکٹر جمشید

نے بُرا سا منہ بنایا۔

”اوہ! میں یہ سوچتا رہا کہ آپ مجھ پر حملہ کریں گے تو میں

بھی ہاتھ پیر ہلاؤں گا۔ جب آپ نے حملہ نہ کیا تو میں نے خیال

کیا کہ آپ اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”نہیں دوست۔ آگے بڑھو۔ ہم دو ٹوک فیصلہ کر کے رہیں گے۔“

”یہ ہوتی نا بات۔“ دشمن نے کہا اور ایک ایک قدم آگے کی

طرت اٹھانے لگا۔

”اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ یہ تو بتا دو

اصلی کرنل کہاں ہیں؟“

”ہوٹل گل رنگ کے پتہ خانے میں۔ انہیں راتوں رات بے ہوشی

کی حالت میں وہاں پہنچایا گیا تھا۔ دوسرے کرنلوں کو بھی۔“

”اوہ۔ اوہ۔ ان کے منہ سے نکلا۔“

”انپکٹر جمشید۔ آپ مجھے فرار ہونے سے نہیں روک سکیں گے۔

لیکن میں اپنے فرار کو کامیابی نہیں کر سکوں گا۔ میری کامیابی

ضرور کشائی میں پڑ گئی ہے۔ اس قدر احتیاط اور چالاک کی سے

بنایا ہوا منصوبہ بھی خاک میں مل گیا ہے۔ حالانکہ مجھے سو



فی صد یقین تھا کہ آپ لوگ منصوبے کی گرد کو بھی نہیں۔  
پہنچ سکو گے۔ آپ کے راستے میں تو میں نے کتنی جال بچھا دیے تھے۔ اور خیال ہی تھا۔ اگر آپ لوگ ایک جال سے نکل گئے تو دوسرے میں پھنس جاتیں گے۔ دوسرے سے نکل گئے تو تیسرے میں۔ غرض کامیابی میرا مقدر بنے گی۔ لیکن افسوس! ایسا ہوا نہیں۔ یہاں تک کہ کروہ خاموش ہو گیا۔

”شکر ہے۔ تم نے یہ بات تو مانی۔ اب اپنی گرفتاری کی بات بھی مان لو! انپکٹر جمشید شوخ آواز میں بولے۔  
”نہیں۔ گرفتار تو خیر۔ آپ نہیں کر سکیں گے۔ آپ اکیلے کیا۔ آپ سب مل کر بھی مجھے گرفتار نہیں کر سکیں گے۔“

”ہم لوگ وقت سے پہلے کچھ کہنے کے عادی نہیں ہیں۔ اور نہ شیخی بگھارنے کے شوقین ہیں۔“ آصف نے مل کر کہا۔

”اور کیا۔ بگھارنے کے لیے اور تھوڑی چیزیں ہیں۔ کہ شیخی بگھاری جائے۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”میں چیلنج کرتا ہوں۔ سب لوگ مل کر مجھے پکڑ کر دکھا دیں۔“  
اس نے بلند آواز میں کہا۔

انپکٹر جمشید نے ان سب پر نظر ڈالی اور پھر بولے :

”نہیں۔ میں اکیلا لڑوں گا۔ اگر میں شکست کھا گیا تو انپکٹر کامران مرزا لڑیں گے۔ یہ بھی شکست کھا گئے تو پھر باقی لوگ

جس طرح پسند کریں گے۔ مقابلہ کر سکیں گے۔“

”اس طرح تو میرے لیے اور بھی آسانی رہے گی۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”تب پھر۔ آگے بڑھو۔ میں بسم اللہ کرتا ہوں! انہوں نے کہا اور اس کی طرف بڑھے۔

دونوں ایک دوسرے کے بالکل نزدیک آگئے۔ اپناک دونوں ایک ساتھ اچھلے۔ دونوں کے سینے پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ دونوں مخالف سمت میں گرے، لیکن فوراً ہی اٹھے اور پھر آگے بڑھے :

”ایک بات سن لیں انپکٹر جمشید۔ اور باقی لوگ بھی سن لیں۔“  
”کون سی بات؟“

”میں بہت چال باز آدمی ہوں۔ جس وقت بھی کوئی چال چلنے کا موقع مجھے ملا۔ میں رکوں گا نہیں، پھر شکایت نہ کیجیے گا۔“

”چلیے نہیں کریں گے شکایت۔“ خان رحمان نے منہ بنایا۔  
”دوسرے یہ کہ جنگ میں دوسرے کو دھوکا دینے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس نے واقعی دھوکا دیا ہے۔ بلکہ اسے عقل مندی کہا جاتا ہے۔ لہذا آپ برا نہ مان جائیے گا۔“  
”نہیں برا مانیں گے۔ تم باتیں کرنے کی بجائے حملہ کرو۔“

حملہ۔" انپکٹر جمشید نے جمل کر کہا۔

اور دوسرے ہی لمحے مجرم نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ تڑ سے گرا اور آن کی آن میں اُن کی ٹانگوں تک پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے انپکٹر جمشید عجیب انداز سے الٹ کر گرے۔ ان کا سر پتھری زمین سے ٹکرایا اور وہ ساکت ہو گئے۔ سب لوگ دھک سے رہ گئے۔ انپکٹر کامران مرزا کا بھی رنگ اڑ گیا، تاہم انھوں نے دشمن کے سامنے آنے میں دیر نہ لگائی۔ اس کے نزدیک پہنچتے ہی انھوں نے دائیں ہاتھ کاٹکٹا اس کی ناک پر دے مارا، لیکن اس نے جھکائی دیتے ہوئے ان کا ہاتھ کلائی کے پاس سے پکڑ لیا اور آگے کی طرف بلا کا جھٹکا دیا۔ انپکٹر کامران مرزا اس طرح آگے کی طرف گئے جیسے کسی بڑے پہلوان نے کسی ننھے سے بچے کو آگے کی طرف جھٹکا دیا ہو۔ وہ دور جا کر سر کے بل گرے اور ساکت ہو گئے۔

ان کی مٹی گم ہو گئی۔ اس قدر پھرتیلا مجرم ان کی نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔

"ہم میں سے۔ ایک ایک سے تمہیں ٹکڑا کرنا ہوگا دوست۔ ہم وہ نہیں۔ جو ہمت ہار دیں۔" خان رحمان کی آواز آجری۔

"آؤ۔ آؤ۔ آگے آؤ۔" وہ ہنسا۔

خان رحمان پیش میں آ کر آگے بڑھے۔ اسی وقت اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ اور خان رحمان کی کمر کی طرف آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے ان کی کمر پر اس کی لات پوری طاقت سے لگی۔ وہ ادند سے منہ کرے اور اٹھ نہ سکے۔

"اب کون آئے گا؟"

"ہم۔ ہم لڑیں گے تم سے۔" آصف گرجا۔

"کیا پدی۔ کیا پدی کا شور بہ۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ چوٹی پارٹی آگے بڑھتی۔ اکرام اور شاہد اس کے سامنے آ گئے، لیکن چند سیکنڈ سے زیادہ نہ ٹک کے انھوں نے منہ کی کھائی۔ اب چوٹی پارٹی آگے بڑھی:

"ہمارے چالاک دشمن۔ ہمارا لڑنے کا انداز ذرا مختلف ہے۔" محمود نے پرسکون آواز میں کہا۔

"کوئی پروا نہیں۔ میں ہر انداز کا جواب دینا جانتا ہوں، دنیا کے طاقت ور ترین لڑاکوں نے مجھے مشق کرائی ہے۔ اور ان سے مشق کرنے کے بعد میں نے ان سب کو بھی شکست دے دی تھی۔ اس پر وہ خود بھی حیران رہ گئے تھے۔ تم لوگ تو ہو کس کھیت کی مولیاں۔" اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"یہ مولیاں کھیت کا نام بتانے کی بجائے۔ کام بتانا پسند کرتی ہیں۔ چلو بھی۔ ترکیب نمبر ۱۳۔" محمود چلایا۔



وہ اُس کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔

”کیا بھی؟“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔  
”چاروں طرف سے بیک وقت حملہ کریں گے ہم۔“

”بہت خوب۔ واہ۔ مزا آ جائے گا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔

فرزاد نے اپنی جگہ سے ہلا کی تیزی سے حرکت کی اور اس کی گردن پر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے بازو اس کی گردن کے گرد کتے چلے گئے۔ ایسے میں محمود آگے بڑھا اور اس نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ آصف نے بھی دیر نہ لگائی۔ اس نے بائیں ہاتھ پر قبضہ کر لیا۔ فاروق نے ایک ٹانگ۔ آفتاب نے دوسری ٹانگ پکڑ لی۔ وہ گئی فرحت۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لیے۔ شوکی برادرز نے بھی ان کی دیکھا دیکھی۔ اس کو کہیں نہ کہیں سے پکڑ لیا۔ حیرت کی بات یہ کہ دشمن نے ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ اور طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا :

”بھئی واہ۔ مزا آ رہا ہے۔“

”اور اب مسٹر مجرم۔ آپ پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں۔“

آصف بولا۔

”کیا واقعی؟ اس نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

”ہاں! تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ محمود بولا۔

”اچھا تو میں تجربہ کرنے لگا ہوں۔ مجھے خوب مضبوطی سے پکڑ لو۔ پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی۔“

”خبر تو اب تمہیں ہو گی۔ مسٹر۔ شوکی نے جھٹکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہوشیار۔ تیار۔“ اس نے پتلا کر کہا اور پھر ایک جھری لی۔

کہنے کو تو اس نے صرف ایک جھری لی تھی، لیکن انہیں یوں لگا۔ جیسے ان کے جسموں میں زبردست زلزلہ طاری ہو گیا ہو۔ اور پھر ان میں سے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ تڑ تڑ کر کے اس سے الگ ہوتے چلے گئے۔ اور رگڑے بھی اس زور سے کہ اٹھنے کی سکت نہ رہ گئی۔ اس دوران باقی لوگ بھی ہوش میں آ چکے تھے اور اٹھنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

”میدان صاف ہو چکا۔ انپکٹر صاحبان۔ میں جا رہا ہوں۔

پھر ملاقات ہو گی۔ اس بار جو منصوبہ میں لے کر آؤں

گا۔ وہ ناکام نہیں ہو گا۔ میں اس منصوبے کی ناکامی کے



تمام تر اہکانات ختم کر کے آؤں گا۔ اچھا۔ اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کسی کے عجیب انداز میں ہنسنے کی آواز سنائی دی، لیکن ہنسنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ تاہم آواز ایک ٹیلے کے پیچھے سے آئی تھی۔

”ٹیلے کے پیچھے کون ہے؟ وہ چلا کر بولا۔

جواب میں کوئی آواز تو سنائی نہ دی۔ لیکن ایک رسی گردش کرتی ضرور نظر آئی۔ اور پھر بجلی کی سی تیزی سے رسی اس کی طرف آئی۔ اس نے رسی کی پیٹ سے بچنے کے لیے جھلانگ لگائی۔ لیکن دیر ہو چکی تھی۔ رسی اس کی کمر کے گرد پٹٹی چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے ٹیلے پر منور علی خان نمودار ہوئے۔ رسی کا دوسرا سرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ دیکھتے ہی مجرم نے رسی کو اپنی کمر کے پاس سے پکڑ لیا۔ اور ایک جھٹکا دیا۔ منور علی خان فضا میں اچھلے اور دُور جا کر گرے۔ رسی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

مجرم نے رسی اپنی کمر سے الگ کرنا چاہی، لیکن اس کے سر پر بندھا ہوا آنکڑا کمر کے گرد پٹٹی رسی میں چنسن چکا تھا۔ اس نے روز لگایا۔ لیکن آنکڑا الگ نہ ہوا۔ اب وہ جھکا اور اپنی پسندلی میں اڑسا ہوا چاقو

نکال لیا۔ ابھی اس نے رسی پر چاقو نہیں چلایا تھا کہ رسی ایک بار پھرتی گئی۔ اس نے چونک کر دوسری طرف دیکھا۔ شاید اسے حیرت ہوئی تھی کہ منور علی خان اس قدر جلد کس طرح اُٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ چونک اٹھا۔ رسی کا سرا اب منور علی خان کے ہاتھ میں نہیں۔ انپکڑ جھید کے ہاتھ میں تھا۔ اور ان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بھی تھی۔

”رسی کاٹنے سے پہلے مجھ سے بھی زور آزمائی کر لو۔“  
”نرود کیوں نہیں؟“ اس نے کہا اور پوری طاقت سے رسی کو جھٹکا دیا۔

لیکن اس بار وہ مار کھا گیا۔ انپکڑ جھید نے رسی کو فوراً چھوڑ دیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے زور میں دھڑام سے گرا۔ اور گرا بھی انپکڑ کامران مرزا کے بالکل قریب۔ دوسرے ہی لمحے ان کے پیر کی ایک زبردست ٹھوکر اس کے سر میں لگی۔ اس کے دونوں ہاتھ سر پر جا لگے۔ وہ چکرایا اور دھڑام سے گرا۔

یہ دیکھتے ہی انپکڑ جھید بلا کی رفتار سے آگے بڑھے اور اسے چھاپ لیا۔ انپکڑ کامران مرزا نے رسی کا دوسرا سرا پکڑا اور اس کی ٹانگوں کے گرد پٹتے چلے گئے۔

اب سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔

”آخر آپ لوگوں نے مجھے پکڑ ہی لیا۔ وہ شوخ انداز میں مسکرایا۔

”ہاں پکڑ لیا۔ لیکن طاقت سے نہیں۔ ذہانت سے۔ اگر میں نے اس بار بھی رسمی پر طاقت صرف کی ہوتی تو میں بھی منور علی خان کی طرح دور جا کر گرتا۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”ہاں! آپ جیت گئے۔ اب آپ کی جیت مکمل ہو گئی، میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی شکست ہے۔ پہلی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہم ابھی ان صاحب کا نام نہیں جان سکے۔“ محمود بولا۔

”اسن پھول کو یاد کرو۔ جو شوکی کی میز پر دکھا نظر آیا تھا۔ زرد رنگ کا مڑجایا ہوا پھول۔ اس پھول کو وہاں چھوڑ کر ہمارے ذہین مجرم نے تو اُسی وقت بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں۔“

”کک۔ کیا۔ مطلب؟“ فرزانہ زور سے اچھل پڑی۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

”ہاں! یہ ہیں مسٹر خزاں کا پھول۔“

”اوہ! ارے۔“ انہیں محمود اور فاروق کے منہ سے

نکلا۔

”کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔“ آصف نے بے چین ہو کر کہا۔

”اب میں سمجھ گیا۔ یہ جی موٹ ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔

”اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”اسے کہتے ہیں اوہ کی فضول خرچی۔“ فاروق بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہمیں اس کا اصلی چہرہ تو دکھا دیں آبا جان۔“ محمود نے کہا۔

”ہاں ضرور کیوں نہیں۔“

انہوں نے اس کا میک اپ اتارنے کی کوشش شروع کر دی: ”یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ برہان کو کیوں ختم کیا گیا؟“ ”وہ اس جگہ کے نزدیک پہنچ گیا تھا جہاں سے ہم گیس خارج کر رہے تھے۔ فوراً ایک غدار کے ذریعے اسے کھائی کی طرف لایا گیا۔ اس نے بتایا۔“

”ہوں! اور وہ لوگ۔ جنہوں نے غداری کی۔ کہاں ہیں؟“

”ان کی لاشیں بھی کھائیوں میں مل جائیں گی۔ ان کی مدد

سے ہی پائپ میں شگاف بنوایا گیا تھا۔ جب ان کا کام پورا ہو گیا تو ہم نے انہیں ختم کر دیا۔ تاکہ وہ کسی کو نہ بتا سکیں



کہ شگاف کہاں ہے؟

”یہ تو ہم اب تک نہیں جان سکے کہ شگاف کہاں ہے؟“  
 ”ایک خفیہ جگہ۔ چیلنگ کے ذریعے نظر نہیں آ سکتا۔ میں  
 خود چل کر وہ جگہ دکھا دوں گا۔ اس نے کہا۔  
 آخر پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ اس کا چہرہ دیکھ  
 سکے۔ وہ دبلا پتلا۔ کمزور سا آدمی نظر آتا تھا؛ تاہم اس  
 کی آنکھوں میں بہت تیز چمک تھی۔ انہوں نے سنا، اینکپٹر جمشید  
 کہ رہے تھے:

”پھول دیکھ کر میں حیرت میں ڈوب گیا تھا، پھر جب  
 گیس والا معاملہ سامنے آیا تو اور حیرت ہوئی۔ کیونکہ جی مون  
 کو تو ہمیشہ بڑی طاقتیں دوسری حکومتوں کے تختے آٹھنے کے  
 لیے استعمال کرتی ہیں۔ اور گیس والے معاملے سے فوری طور  
 پر تختہ الٹ جانے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ یہی وجہ  
 تھی کہ میں نے حالات کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کیا  
 اور پھر میری نظری کرنل راضی پر جم کر رہ گئیں۔ ورنہ ہم  
 اس منصوبے کا تیا پانچہ کبھی نہیں کر سکتے تھے۔“  
 ”تیا پانچہ تو کیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیس کا سہرا کس کے  
 سر رہا؟“

”میرے خیال میں تو۔ انکل منور علی خان کے سر باندھ

دیتے ہیں۔ یہ اگر وار نہ کرتے۔ تو شاید۔ محمود کہتے کہتے رک  
 گیا، اسی وقت منور علی خان نے کانپ کر کہا تھا:

”ارے باپ رے۔ م۔ میں۔ میں سہرا نہیں بندھواؤں  
 گا۔ میری شکاری زندگی کا تیا پانچہ ہو جائے گا۔“  
 ”آپ۔ شادی والا سہرا سمجھ رہے ہیں کیا۔“ ناؤق ہنسا۔  
 ”ہاں۔ اور کیا۔ تم کون سے سہرے کی بات کر رہے ہو۔“  
 انہوں نے حیران ہو کر کہا۔  
 اور وہ ہنسنے لگے۔







## تین مزے دار فائدے

○ فتنے کی چوری کے بعد "جی موٹ" کا دار" شائع ہو رہا ہے۔

○ آپ یہ خاص شماره ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر ارسال کر کے گھر بیٹھے وقت سے پہلے حاصل کر سکتے ہیں۔

○ نہ صرف یہ۔ بلکہ تین مزے دار فائدے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

○ پہلا فائدہ۔ اشتیاق احمد کا وزٹنگ کارڈ دستخط کے ساتھ ہر ناول کے ساتھ ارسال کیا جائے گا۔

○ ناول پر بھی ان کے دستخط ہوں گے۔

○ وقت سے پہلے ناول حاصل کر کے آپ انعامی مقابلے میں انعام جیتنے کے امکانات کو روشن بنا سکتے ہیں۔

— ہیں نا مزے دار فائدے تین —

## پانچ ہزار روپے کے نقد انعامات

### فتنے کی چوری

○ کا انعامی سوال

س: انسپٹر کامران مزانے اکرام اور شاہد کو الگ لے جا کر کیا ہدایت دی تھی؟

— انعامات کے تفصیل —

۲۰۰۰۰ روپے کا نقد انعام سب سے پہلے موصول ہونے والے درست جواب پر۔

۱۰۰۰۰ " " " " دوسرے موصول ہونے والے درست جواب پر۔

۵۰۰۰ " " " " تیسرے موصول ہونے والے درست جواب پر۔

— بقیہ ۱۵۰۰۰ روپے —

ان کے بعد موصول ہونے والے پہلے پندرہ درست جوابات

پر ۱۰۰۰۰ روپے فی کس —

○ جوابات درج ذیل پتے پر ارسال کریں:

اشتیاق احمد، وی ۴/۴، شیلڈس ٹاؤن، جنگ، پوسٹ کوڈ ۳۵۲۰۶

## آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ، انیسٹر جمشید

آفتاب، آصف، فرحت، انیسٹر کامران مرزا

اور شوکی برادرز کی مشترکہ مہم

— ناول نمبر ۱۸۸ —

## جی موٹ کا وار

— مصنف: اشتیاق احمد —

○ لیجیے! خاص نمبر "فتنے کی چوری" کے بعد ایک اور مشترکہ

مہم کا تلف آٹھائیے —

○ لیکن اس کا شمار ہم خاص نمبروں میں نہیں کریں گے۔ اسی

لیے ناول کا نمبر دیا جا رہا ہے —

○ تاہم یہ ناول بھی آپ کے لیے کئی خاص نمبروں سے زیادہ

بھاری ہوگا۔

○ پہلے صفحے سے سنسن کا ایسا آغاز کہ آپ اچھل اچھل پڑیں

گے۔ یہاں تک کہ آپ کا جسم تنک کر چور ہو جائے گا

اور مزید اچھلنا آپ کے لیے ممکن نہیں ہوگا، لیکن اس

کے باوجود آپ کو اچھلنا ہوگا۔

○ محمود، فاروق اور فرزانہ پر بھی ایسے لمحات زندگی میں کبھی

نہیں آئے تھے۔ ان کی الجھنوں کا کیا پوچھنا۔

○ بیگم جمشید بھی چکر پر چکر کھاتی نظر آئیں گی۔

○ اور پھر جب پروفیسر داؤد اور خان رحمان وہاں پہنچے۔

○ آئی جی صاحب کی میز پر کسی چیز کے اوپر ایک کپڑا ڈھاپ

دیا گیا تھا۔ کپڑے کے نیچے کیا تھا۔ آپ لرز کر رہ

جائیں گے۔

○ جی موٹ اس بار ایک عجیب پروگرام لے کر آیا

تھا۔

○ کیا اس کی شیطانی چال کا جواب ان کے پاس تھا؟

○ کیا انیسٹر جمشید بھی چال کا کوئی توڑ کر سکے۔

○ قدم قدم پر آپ کو ایکشن ملے گا۔

○ اور ہر لمحے پر دل دھڑکے گا۔

○ آپ سمجھ نہیں پائیں گے کہ چکر کیا ہے۔

آخری سطور تک ناول آپ کو گزرت میں لیے رہے گا۔

پھر آخر میں جب پردے اٹھیں گے تو آپ ایک بار پھر اچھلیں گے اور پھر اچھلیں گے۔

یہ ناول گویا آپ کے لیے اچھی خاصی ورزش کی دعوت لے کر آ رہا ہے۔

ورزش کی دعوت۔ ارے۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔

شوکی کی انوکھی ترکیب پر آپ بے ساختہ مسکرا اٹھیں گے۔

اور جب۔ جی موٹ ان کے سامنے آیا۔ تو ان سب پر کیا گزری۔

وہ اکیلا ان سب پر جاری تھا۔ اس نے ان کے چمکے چمکا دیے۔

جی موٹ پر فتح ان کے لیے ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔

ایک اور لمحہ۔ جب جی موٹ اور پروفیسر داؤد آمنے سامنے ہوئے۔

پروفیسر داؤد۔ جھوٹا بھڑانا نہیں جانتے تھے۔ انھیں

بھی اس کے مقابل آنا پڑ گیا۔

○ ایکٹری اور ارتاش کون تھے؟

○ انیکٹر جشید کا پراسرار دوست مسٹر بارڈی بھی آپ کو آنکھن میں ڈال دے گا۔

○ آخر تک آپ کو سپنس اور ایکشن قدم قدم پر ملے گا۔ اور آپ حیرت کے سمندر میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔



اپنا ناول آج ہی بک کروا لیں۔ "فتنے کی چوری" کی طرح کہیں ایک بار پھر آپ ہاتھ نہ ملتے رہ جائیں۔ دوبارہ ناول اس قدر جلد شائع نہیں ہو پاتا۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ۱۵/۰۰ روپے کا منی آرڈر دفتر کے پتے پر ارسال کر دیں۔ یہ نمبر آپ کو عین وقت پر گھر بیٹھے مل جائے گا۔ بصورت دیگر آپ اپنے بک شال والے کے پاس پیسے جمع کروا دیں۔ یا پھر ٹھیک بیس تاریخ کو بک شال کا رخ کریں۔





آئندہ خاص نمبر کے ایک جلد کے

انسپکٹر ارسلان سیریز ۳۳

# انجانے دشمن

— مصنف: آفتاب احمد —

- انسپکٹر ارسلان سیریز کا ایک اور شان دار ناول —
  - اس ناول میں بھی وہ آپ کو قدم قدم پر چونکائیں گے —
  - اور آپ کے کردار آپ کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گے —
  - ہر قدم پر سپنس — ہر قدم پر مہم —
  - آپ نے ایسی مہماتی کہانی شاید پہلے نہ پڑھی ہو گی —
- قیمت : ۱۵/۰۰ روپے

# مُشیّا کی آمد کا انعام

سوال یہ تھا: آپ کے خیال میں مجرم کون ہے؟  
جواب: خالد کریم —

- موصول ہونے والے پہلے دس درستی جوابات پر فیس ۱۰۰، ۱۰۰ روپے کا نقد انعام روانہ کیا جا رہا ہے — (ادارہ)
- ① عبدالشکور ٹیلر ماسٹر، اے بی نیا لائن، کوادر نمبر ۱۸۵ جی، کراچی نمبر ۳ —
  - ② محمد طارق، مکان نمبر ۳۵، گلی نمبر ۲، محلہ رحمانیہ، میاں چنوں —
  - ③ ذوالفقار احمد معرفت محبوب عالم چکی والا، قلعہ منڈی جہلم —
  - ④ غلام محی الدین معرفت محمد شعبان گریڈ سٹور، صدیق چوک، مری —
  - ⑤ ظاہر علی خان ولد وارث خان، نیو آبادی، صدر بازار، رسالپور —
  - ⑥ محمد منظر علی، مکان نمبر ۹، گلی نمبر ۱۲، مجاہد آباد، لاہور —
  - ⑦ عامر یحیٰی عالم، مکان نمبر ۷، گلی نمبر ۵، سیکٹر جی ۴/۳، اسلام آباد —
  - ⑧ فرمان رشید، مکان نمبر ۴، گلی نمبر ۴، محمدی محلہ، دکن پورہ، لاہور —
  - ⑨ مغل مختار احمد، بازار ۲، گلی ۲، مکان ۲۰۶ پی، رضا آباد، فیصل آباد —
  - ⑩ عمران رضا، گلستان سٹریٹ نمبر ۹، مکان نمبر ۶، پارک مین مرنگ تھانہ، پیل روڈ، لاہور —

# مہمان کا ہنگامہ

## کا انعام

سوال یہ تھا: آپ نے مجرم کو کون سے صفحے پر پہچانا؟  
جواب: کسی پر نہیں۔

موصول ہونے والے پہلے پانچ درست جوابات پر فی کس ۵۰، ۵۰ روپے کا نقد انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

- ① فرمانہ موسیٰ، ہیمائی چیمبر، پارہ سرٹٹ، کراچی۔
- ② عبدالرحمن گل معرفت منشی محمد علی پان سگریٹ ڈیلر، چوک طبایاں مظفر گڑھ۔
- ③ محمد ادیس قریشی، وارڈ نمبر ۵، مکان نمبر ۲۲/۵ مٹھی ہماؤ الدین۔
- ④ طلعت نعیم معرفت وارنٹ آفیسر عبدالشکور نعیم، کوادر نمبر ۱۳/۶ بی اے ایف قریشی کیمپ، لاہور کینٹ۔
- ⑤ عامر حمید مغل، مکان نمبر ۱-۲۹۸ بی بی، گلی نمبر ۱۳، کرشن پورہ باغ سرداران، راولپنڈی۔

# فرضی خوف

## کا انعام

سوال یہ تھا: شوکی نے حیران ہو کر غامداری کے ملازم رشید کی طرف کیوں دیکھا؟  
جواب: کیوں کہ وہ پہاڑیوں میں اس کی آواز سن چکا تھا۔

موصول ہونے والے پہلے پانچ درست جوابات پر فی کس ۵۰، ۵۰ روپے کا نقد انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

- ① ندیم اختر رانا، ۱۰۷/۹ ڈیگر سوسائٹی، ایف بی ایریا، کراچی ۳۸
- ② خواجہ بلال سلیم، ۵۰ سول لائنز، جہلم۔
- ③ عمر منیر، اے-۶۱ خادم حسین روڈ، راولپنڈی۔
- ④ نوید حفیظ، مکان نمبر ۱۱، بلاک نمبر ۳۱۸، ایمپرس روڈ، دیوے کارڈ رنگ روم، دیوے اسٹیشن، لاہور۔
- ⑤ راؤ سکندر، ۱۱/۳ صدیقی کیمپ، پی اے ایف، لاہور کینٹ، لاہور۔

# آخری جھٹکا

## کا انعام

سوال یہ تھا: انیکٹر جیٹ اس سے آگے کیا کتنا چاہتے تھے، تھوڑی دیر بعد یہ خود بخود بحرم ثابت ہو جائیں گے، جب ان کے بلا ...  
جواب: جب ان کے بلائے ہوئے وکیل آجائیں گے۔

موصول ہونے والے پہلے پانچ درست جوابات پر ۵۰، ۵۰ روپے کا نقد انعام رواج کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

① عرفان ریاض، مکان نمبر ۱-۶۷، گلی نمبر ۲، گارڈن کالونی، فیصل آباد، کوڈ ۳۸۰۹۰۔

② محمد یونس معرفت کامران بک شال نزد کے پی ٹی گراؤنڈ کیمائی، کراچی۔

③ عبید الرحمن، مکان نمبر ایم-۱۳۰۵، گلی نمبر ۵۵، محلہ امر پورہ،

راولپنڈی۔

④ مختار علی، ۱۹ چیمبر لین روڈ، احاطہ حاجی قادر بخش، لاہور نمبر۔

⑤ عابد لودھی، مکان نمبر ۸۹-۳۸۸-VII بی، فتح شیر کالونی،

ساہیوال۔

# مرزا طاہر کے فرار کی کہانی

اس کے ڈرائیور کی زبانی

○ آپ یہ عنوان پڑھ کر چونک گئے ہوں گے۔

○ قادیانیوں کا خلیفہ مرزا طاہر چند سال پہلے ملک سے لندن فرار ہو گیا تھا۔

○ فرار کے وقت مرزا طاہر کے جس ڈرائیور نے اس کی کار چلائی، فرار کی یہ سنسنی خیز داستان اس کی زبانی سنیں۔

○ کیوں کہ ڈرائیور اب مسلمان ہو چکا ہے۔

○ نبوت کے ڈاکوؤں کا پیشوا کس طرح ملک سے بھاگا۔ یہ کہانی آپ کے لیے بے پناہ دل چسپ ثابت ہوگی۔

○ مرزا طاہر کے ڈرائیور سے یہ انٹرویو خود اشتیاق احمد نے لیا۔

○ چھوٹا سا یہ کتابچہ آپ ڈیڑھ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے منگوا سکتے ہیں۔

خصوصی پیش کش آپ یہ کتابچہ جی ہون کا دار براہ راست ادارے سے منگوا کر بالکل مفت حاصل کر سکتے ہیں۔



اپنی فرصت مطالعہ میں صرف کیجیے  
مطالعہ کے لیے عمدہ کتب منتخب کیجیے

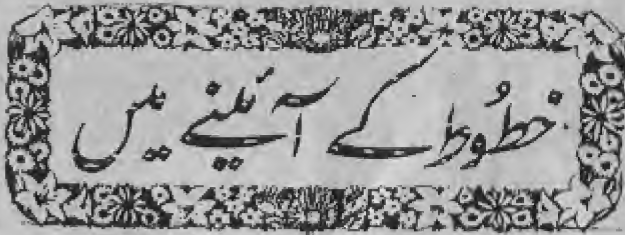
خوش ذوق قارئین کے لیے نامور مصنفین کی تازہ ترین کتابیں،  
خوب صورت کتابیں و رسائل، بچوں کے لیے اُن کے مقبول ترین  
مصنف اشتیاق احمد کی نئی اور پرانی کتب و دیگر تفریحی ادب۔  
شام کے اوقات میں تشریف لائیے۔  
جمعہ کو تعطیل ہوگی۔

خصوصی نوٹ : اس اشتہار کا حوالہ دینے پر ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء تک  
رکنیت فیس نہیں لی جائے گی (حوالے کے لیے ناول ہمراہ لانا  
ضروری ہے۔)



ایمن لائبریری

مین روڈ چنیس روڈ — کراچی ۲۴



## خطوط کے آئینے میں

نوٹ : پہلے تین خط انعامی قرار پائے۔ فیکس بچا بچا  
روپے کا نقد انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

پیارے اہل اشتیاق احمد

السلام علیکم ! ابھی ابھی میں نے آپ کا ناول "دستے کا  
پہاڑ" پڑھا۔ پڑھ کر صبح معنوں میں خوف سے رز آٹھا کہ  
خدا نخواستہ اگر ہمارے ملک کی یہ حالت ہو گئی تو کوئی  
دوسرا کامران مرزا سامنے آسکے گا کہ نہیں۔ اس ناول کے  
ذریعے آپ نے مملکت خدا داد پاکستان میں اسلام اور اس  
کے متوالوں کو درپیش روکاؤں اور مصائب پر روشنی ڈالی  
ہے۔ مولانا عبداللہ کا کردار ایک ایسے سچے اور باکردار مسلمان  
کا کردار تھا جو کہ سچائی، بولنے سے گھبراتا نہ تھا، بلکہ چاہتا  
تھا کہ معاشرے سے ساری بدعتیں ختم ہو جائیں۔ وہ کمزور  
مسلمان نہ تھا اور حکمران کے سامنے کلمہ حق بولنے سے گھبراتا  
نہ تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :  
 ”تم میں سے کوئی شخص اگر کسی برائی کو دیکھے تو  
 اسے طاقت سے روک دے ، اگر اس کی طاقت بھی  
 نہ ہو تو زبان سے منع کرے ، اگر اس کی بھی طاقت  
 نہ ہو تو دل میں برا جانے ، یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ  
 ہے ۔“

جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

”سچائی میں نجات اور حفاظت ہے اور جھوٹ میں ہلاکت۔“  
 دوسری طرف ہمارے سامنے اصولوں اور انصاف پسندی کا پتلا  
 خالد شیرازی ہے جو کہ بیوروکریسی کے سامنے کٹھ پتلی بن سکا ؛  
 بچوں کو وہ جانتا تھا کہ راجہ حق اور انصاف پر قائم رہنا مومنوں کی  
 نشانی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

”انصاف پر قائم رہو ، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے  
 والوں سے محبت کرتے ہیں۔“

پس اس کمائی کی جان یہ دو کردار تھے ۔

سید کاشف حسین ، ۱۳۷۱-۱۷۱۱ء سے بلاک II گلشن اقبال ، کراچی

پیارے انکل اشتیاق

آداب ! آپ کے اس ماہ کے ناول پڑھے ، بہت ہی  
 اچھے تھے ، لیکن پھر بھی ”راتے کا پہاڑ“ کی تو کچھ اور ہی  
 بات تھی ۔ اس ناول میں آپ نے بڑی ہی خوب صورتی  
 سے اسلامی نظریے کو واضح کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ  
 مسلمان قویں اگر مستحکم ہو جائیں تو بہت کچھ ان کے بس میں  
 ہو سکتا ہے ، بہر حال آپ کے ناولوں کی جتنی بھی تعریف کی  
 جائے کم ہے اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کن کے الفاظ  
 سے آپ کی ناول نگاری کی تعریف کروں ۔ اگر محمود کے الفاظ  
 سے کرتی ہوں تو فرزند ان کی تائید کرے گی اور اس طرح  
 بے چارہ فاروق اکیلا رہ جائے گا ، اس لیے بہتر یہ ہے کہ  
 میں آپ کو بیگم جمشید کے الفاظ سے خدا حافظ کر دوں ۔  
 خدیجہ نگریا ، کے ڈی اے گلشن ، کراچی ۶

پیارے انکل اشتیاق احمد

السلام علیکم ! آپ کے قریباً تمام ناول پڑھے ہیں ، لیکن  
 خط پہلی مرتبہ لکھ رہی ہوں ، اس امید پر کہ آپ کی آنکھوں  
 کی نذر ہو جائے ۔ اس ماہ کے ناول پڑھ کر قلم خود بخود  
 چلنے لگا ۔ ”ٹرین کی تلاش“ اور ”نیلا گھوڑا“ اچھے اور منفرد ناول  
 تھے ۔ آپ کی کہانیاں پڑھ کر آپ کی ذہانت کے قائل ہو گئے



اور آخر آپ نے اپنی ذہانت کا بولہ منوا لیا ، آپ کی کہانیاں پڑھ کر جو جذبہ وطن کے لیے پیدا ہوتا ہے ، دل چاہتا ہے کہ انیسٹر جمشید بن کر وطن کی خدمت کروں اور ملک میں گندگی پھیلانے والے شر پسندوں کو ختم کر دوں ، اور اگر انیسٹر جمشید نہ بن سکی تو اشتیاق احمد بن جاؤں جو کم از کم اپنے خیالات کا اظہار کر کے لوگوں کو محب وطن ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے ، لیکن کیا کروں ، خیالی پلاؤ پکا کر ہی گزارا کر لیتی ہوں۔ آپ کی تعریف کیا کروں ، آپ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ پورے پاکستان میں جتنے بھی آپ کی کہانیاں پڑھنے والے ہیں ، وہ دن رات آپ کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے ہیں۔ فدا کرے ، آپ کے کردار زندہ ہو جائیں اور وہ ہمارے ملک کو دشمنوں کی سازشوں سے بچاتے رہیں۔

یاسمین سلطان ، جہانگیر روڈ ، کراچی

ڈیر انکل اشتیاق

السلام علیکم ! آپ کا ۲ مارچ ۸۸ء کا لکھا ہوا خط مجھے آج ۱۲ اپریل ۸۸ء کو ملا ، دیر سے سہی ، لیکن ملا ضرور۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے خط کا جواب دیا۔ پہلے

تو خط دیکھ کر مجھے یقین نہیں آیا ، لیکن جب کھول کر دیکھا تو اس بات کا ثبوت مل گیا کہ ہر مصنف آپ کی طرح عظیم نہیں ہے ، کیوں کہ میں نے پہلے بہت سے لوگوں کو لکھا ، لیکن مایوس ہونا پڑا ، کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ میرے امی اور ابو دونوں ڈاکٹر ہیں اور ملتان میں رہتے ہیں ، جب کہ میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ مالٹا میں رہتی ہوں۔ دسویں جماعت کی طالبہ ہوں اور مستقبل میں ڈاکٹر بننے کا ارادہ رکھتی ہوں ، تاکہ اپنے ملک میں دیکھی انسانیت کی خدمت کر سکوں۔ میں ہوشل میں رہتی ہوں اور یہاں بہت سارے ملکوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ مجھے اردو لکھنے کی مشق نہیں ہے ، یہ تو بس آپ کے ناول کا کمال ہے ، جن میں دل چپی لے کر اور باقاعدگی سے پڑھ کر اتنا کچھ لکھ لیتی ہوں۔ سچ سچ بتائیے کہ آپ نے اتنا اچھا ذہن کہاں سے پایا۔ آپ کے ناول بہت دل چسپ اور عمدہ ہوتے ہیں۔ ہر ناول میں ملک کی بھلائی اور ترقی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ویسے مجھے انیسٹر جمشید سیریز بہت پسند ہے ، اور خاص طور پر فاروق کا کردار۔ کاش میرے ملک میں ایسے بچے اور انیسٹر پائے جاتے۔ میں نے آپ کے ناولوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

رابعہ سرور چودھری ، برکارا ، مالٹا





اشتیاق احمد

سے بھرپور ناول

یہ ناول ہے

میرزا غلام احمد، قادیان، ہندوستان  
آلہ آباد، قادیان، ہندوستان  
اور..... شادی ہونے لگی۔

(۱۱)..... جی کوئی چیز..... ۱۵ روپے

(۱۲)..... ایک شہید..... ۱۵ روپے

یہ ناول ہے

میرزا غلام احمد، قادیان، ہندوستان  
آلہ آباد، قادیان، ہندوستان  
اور..... شادی ہونے لگی۔

(۱۳)..... جی کوئی چیز..... ۱۵ روپے

(۱۴)..... ایک شہید..... ۱۵ روپے

اشتیاق احمد

۱۳۱۵۲۶  
۶/۸ شیلڈ ٹاؤن - جھنگ صدر - ۱۳۱۵۲۶